مجموعۂ تفاسیرِ
ابو مسلم اصفہانیؒ
ترجمہ وتہذیب
سید نصیر شاہ۔ رفیع اللہ

مجموعۂ تفاسیر
ابو مسلم اصفہانیؒ
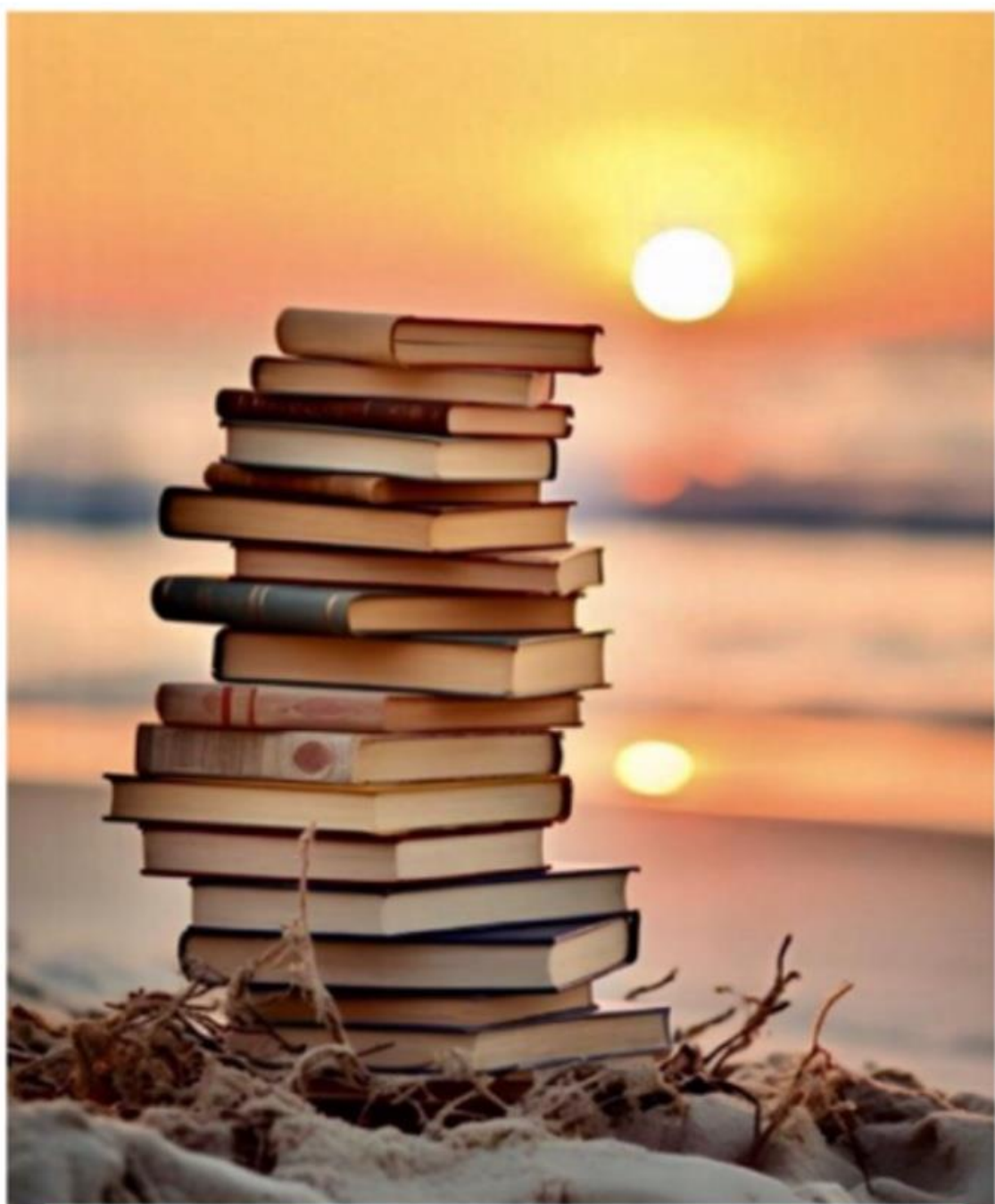
مجموعۂ تفاسیر

ابو مسلم اصفہانیؒ

ترجمہ و تہذیب

سید نصیر شاہ ۔ رفیع اللہ ایم اے

ادارہ ثقافتِ اسلامیّہ

2۔ کلب روڈ، لاہور

فون: 042-36363127, 042-36305920 ای میل: iic-lhr@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

عنوان: مجموعہء تفاسیر ابو مسلم اصفہانیؒ

ترجمہ و تہذیب: سید نصیر شاہ، رفیع اللہ ایم اے

طبع دوم: 2018ء

ناشر: قاضی جاوید، ڈائریکٹر

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور

مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

تعداد: 500

قیمت: 400 روپے
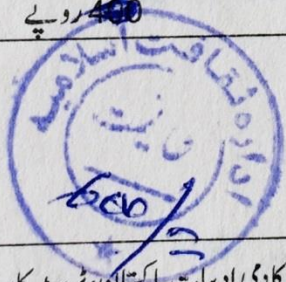
یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان، ٹریڈ کارپوریشن لمیٹڈ اور حکومتِ پنجاب کے محکمہ اطلاعات و ثقافت کے تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

"مجموعۂ تفاسیر ابومسلم اصفہانی" میں ابومسلم کے ان تفسیری اقوال کو یک جا کیا گیا ہے جو امام فخر الدین رازی نے تفسیر میں مختلف مقامات پر نقل کیے تھے۔ آج ابومسلم کی اصل تفسیر دنیا سے ناپید ہے، صرف یہی چند اقوال ہیں۔ جو تفسیر کبیر میں مل جاتے ہیں، انھی اقوال کو اُردو زبان میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جہاں ابومسلم نے دوسرے مفسرین سے اختلاف کیا ہے وہاں ہم نے مختصراً دوسرے مفسرین کے اقوال بھی پیش کر دیے ہیں تاکہ ایک عام قاری دونوں قسم کی آراکو سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکے۔ جہاں ابومسلم کے کسی قول میں اجمال تھا، وہاں ہم نے اپنی طرف سے اس کی تفصیل کر دی ہے تاکہ پڑھنے والے خلجان میں نہ رہیں۔

اس تفسیر کو محض ایک علمی ذخیرہ کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے ورنہ اس میں بیشتر ایسے مقامات ہیں جن سے ہمیں اختلاف ہے[1]۔ لیکن ہم نے اپنی رائے کو واضح نہیں کیا کیونکہ ہماری حیثیت نقاد کی نہیں مترجم کی تھی۔

اعتزال ایک ایسی فکری تحریک کا نام تھا جس نے اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق قرآن حکیم کی تفسیر پیش کی۔ زیر نظر کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اس امر کو خصوصیت سے

---

[1] ناشرین کو بھی۔ (ناشرین)

سے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

مقدمہ میں اعتزال کی مختصر تاریخ اور معتزلہ کے عقائد بھی اجمالاً بیان کیے گئے ہیں۔ یہ چیزیں اس لیے ضروری سمجھی گئیں کہ معتزلہ جن کا کسی زمانہ میں ڈنکا بجتا تھا، آج تاریخ کا ایک گم شدہ باب ہیں، اور ان کے متعلق ہمیں بہت کم علم حاصل ہے۔ معتزلہ کے عقائد کے سلسلہ میں کہیں کہیں "اشعریہ" اور "ماتریدیہ" کا نام بھی آیا ہے۔ یہ دونوں کلامی مذہب ہیں۔ اول الذکر امام ابو الحسن اشعری سے منسوب ہے جو پہلے معتزلی تھے بعد میں سنّی اور شافعی ہو گئے۔ امام غزالی بھی اشعری ہیں اور احیاء علوم الدین میں انہوں نے اس مذہب کے اصول بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ "ماتریدیہ" ابو منصور ماتریدی سے منسوب ہے۔ یہ اصل میں حنفیہ کا کلامی مذہب ہے۔ ابو منصور دو واسطوں سے قاضی ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد تھے۔ علامہ ابن البیاضی کا قول ہے کہ "اشعریہ" اور "ماتریدیہ" پچاس مسائل میں باہم مختلف ہیں۔ "ماتریدیہ اکثر مسائل میں معتزلہ کے ہم خیال ہیں۔" عقائد کو پڑھ کر آپ کو معلوم ہوگا کہ آج اکثر علمائے حنفیہ اشاعرہ ہی کے ہم عقیدہ ہیں حالانکہ قدیم زمانہ میں کسی حنفی کا اشعری ہونا بہت تعجب کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علامہ ابن الاثیر تاریخ الکامل میں لکھتے ہیں: "یہ نہایت عجیب بات ہے کہ کوئی حنفی کلامی مذہب میں اشعری ہو۔"

تفسیر کبیر میں سے ابو مسلم کے بکھرے ہوئے اقوال جمع کرنا بڑا مشکل کام تھا، اس لیے ہوسکتا ہے کہ ہماری تمام عرق ریزیوں اور جگر کاویوں کے باوجود کوئی قول نقل ہونے سے رہ گیا ہو۔ بہر حال ہم نے امکان بھر کوشش کی ہے۔ جب ہم اقوال جمع کرنے کے بعد انہیں اُردو کا لباس پہنا چکے تھے تو اس وقت معلوم ہوا کہ کوئی ابو سعید انصاری صاحب ہیں جنہوں نے پہلے ان اقوال کو جمع کیا تھا۔ اگرچہ اُنہوں نے انہیں اُردو میں منتقل نہیں کیا تھا۔ لیکن اقوال کو بہر حال یک جا تھے۔ اِس لیے ہم نے اس کتاب کو تلاش کرنے کی بھی بڑی کوشش کی، تاکہ زیر نظر کتاب کو اس سے ملا کر دیکھ لیا جائے۔ ممکن ہے کوئی قول

ہم سے چھوٹ گیا ہو۔ مگر افسوس ہے کہ وہ کتاب ہمیں نہ مل سکی۔

آخر میں ہم دوبارہ یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ کتاب کے ہر لفظ کے ساتھ مترجم کا متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا[1]۔

قرآن حکیم قیامت تک کے لیے رہنما ہے۔ اگر اس نے آج سے صدیوں پہلے یونانی فلسفہ کو شکست دی تھی تو آج یہ مغرب کی گمراہیٔ فکر کے سیل بے پناہ کا مقابلہ کر کے اُس کا رُخ بھی پھیر سکتا ہے ہمارا ایمان ہے کہ انقلاب روزگار کی کوئی کروٹ اور فکر کی تبدیلی کی کوئی منزل ایسی نہیں جہاں قرآن ہماری رہنمائی نہ کرے ؎

گر تو مے خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم

فاش گویم آں چہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

مثل حق پنہان و ہم پیداست او
زندہ و پائندہ و گویاست او

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

---

[1] نہ ہی ناشرین کا۔ (ناشر)

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست
ایں جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
مے دہد قرآں جہانے دیگرش
یک جہانے عصرِ حاضر را بس است
گیر اگر در سینہ دل معنی رس است

آیات کے ترجمہ میں شاہ رفیع الدین رح ۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور محمد علی صاحب لاہوری کے تراجم سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ جہاں آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، وہاں اوپر سورہ کا نمبر ہے نیچے آیت کا نمبر مثلاً $\frac{۲}{۱۰۲}$ کا مطلب ہے دوسری سورۃ کی آیت نمبر ۱۰۲ ۔ آیات کے نمبر محمد علی صاحب لاہوری کے ترجمۂ قرآن سے نوٹ کیے گئے ہیں ۔

فہرستِ مشمولات

مقدّمہ

اسلام دنیا میں امن و سلامتی کا پیغامبر بن کر آیا اور مذاہب باطلہ کے پنجوں میں جکڑی ہوئی انسانیت نے لپک کر اس کو قبول کیا، لیکن گمراہی فکر اسلام کی اس مقبولیت کو دیکھ کر نچلی نہ بیٹھ سکتی تھی۔ ابلیس نے بھی اپنے تخت کی عظمت کو بچانے کے لیے باطل پرستیوں کی صف در صف فوجیں جمع کر دیں اور مسلمانوں کو شیطان کے خلاف چومکھی لڑائی لڑنا پڑی کفر شمشیر بکف آیا تو حق کے سپاہی سینہ سپر ہو گئے اور باطل نے ضلالتِ فکر کے طوفان اٹھائے تو صداقت کے پرستاروں نے اُن کے مقابلے میں سرِ فلک بند باندھ دیے۔

معتزلہ

جب یونانی فلسفہ اور منطق نے اسلام کے خلاف صف آرائی کی تو مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جنھوں نے مخالفین کی اس فوج کو شکست دی اور علمی و فکری دنیا میں بھی اسلام کی عظمت کی دھاک بٹھا دی۔ معتزلہ سے پہلے اسلامی تاریخ میں کسی ایسے فرقہ کا سراغ نہیں ملتا جو ماوراء الطبیعی مسائل میں عقلی و علمی انداز سے زبان کھولتا ہو۔ معتزلہ کو اس بارہ میں اولیت کا فخر حاصل ہے۔ کتنے علوم ہیں جو محض اس فرقہ کی وجہ سے عالمِ وجود میں آئے۔ کتنے عقائد ہیں جو آج تک ہم میں رائج ہیں مگر ہمیں یہ معلوم نہیں کہ کن لوگوں کی نکتہ سنجیوں نے یہ دقیق نکات کھولے ہیں۔

اعتزال کی تاریخ

اسلام جب جزیرۂ عرب میں رہا مسلمانوں کو فلسفہ و منطق سے کوئی لگاؤ نہ تھا کیونکہ عرب کا اصلی مذاق فکر نہیں عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کے مسائل پر

تو بہت کچھ تحقیق ہو چکی تھی لیکن "ایمانیات" سے متعلق کچھ زیادہ عرق ریزی نہیں کی گئی تھی بلکہ اجمالی عقائد کافی سمجھے گئے تھے۔ لیکن جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو ایرانی، یونانی اور دوسری قومیں اسلام کی حلقہ بگوش ہونے لگیں۔ ان لوگوں کے قدیم مذاہب میں خدا، صفات خداوندی، قضا و قدر اور جزا و سزا کے متعلق خاص عقائد تھے۔ ان عقائد میں سے جو عقیدے صریحًا اسلام کے مخالف تھے اُن کے بُرے اثرات تو اُن کے دماغوں سے نکل گئے لیکن جہاں اسلامی عقائد کے کئی پہلو ہو سکتے تھے اور کچھ خیالات اُن کے قدیم عقائد سے مشابہت رکھتے تھے، وہاں بالطبع وہ انہی خیالات و افکار کی طرف مائل ہو گئے۔ مثلاً یہودیوں کے ہاں خدا کو مجسم تصور کیا جاتا تھا جب وہ مسلمان ہوئے تو قدرتی طور پر وہ ان ہی آیات کو مدارِ ایمان قرار دینے لگے جن میں اللہ تعالیٰ کی نسبت ہاتھ اور مُنہ وغیرہ کے سے الفاظ موجود ہیں۔ پھر یہ نومسلم صدیوں سے فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکتہ آفرینیوں کے عادی تھے اس لیے اُنہوں نے علمی مباحثوں کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی نصرانی، زروشتی اور یہودی علماء نے جو فلسفہ و منطق سے واقف تھے مسلمانوں سے علمی مناظروں کا آغاز کر دیا۔ ایسے مناظروں کا گہوارہ عراق تھا کیونکہ وہاں مختلف قوموں کے لوگ جمع تھے۔ اب ایسے ایسے عقائد و معاملات میں گفتگوئیں شروع ہو گئیں جن کے متعلق محدثین زبان تک ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ فی الواقع یہ وقت اسلام کے لیے بڑا ہی نازک وقت تھا۔ اور پھر جب سریانی، یونانی، پہلوی اور ہندی زبانوں سے حکمت و فلسفہ کی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں اور لوگوں میں فلسفیانہ مذاق پھیل گیا، تو جیسے سیلاب کا بند ٹوٹ گیا۔ قرآن کی آیات اور اسلامی عقائد کو غیر مسلموں نے ہدف بنالیا اور اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ محدثین اور فقہاء صرف روایات کی مدد سے اس سیلِ بے پناہ کا مقابلہ کرنے نکلے۔ مگر یہ ان کا میدان نہیں تھا۔ اور یہ اُن کے بس کی بات نہ تھی کہ ان لوگوں کے اعتراضات کا جواب دے سکیں۔ کیونکہ ان کا سارا علم منقولات تک محدود تھا۔ اور مقابلہ بھی اُن لوگوں سے آپڑا تھا جو نہ قرآن کو مانتے تھے نہ احادیث کو۔ فکری گمراہی کا مُنہ زور طوفان حصارِ اسلام کی بنیادوں سے ٹکرا

رہا تھا۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ انہی لوگوں کے ہتھیاروں سے انہیں شکست دی جاتی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ معترضین کے مذاہب اور اُن کے فلسفہ سے پوری واقفیت ہوتی۔ الحاد کے اس "سیلِ سبک سیر و زمیں گیر" کا مقابلہ کرنے کے لیے معتزلہ میدان میں آئے۔ وہ حریفوں کے مقابلہ میں ہر طرح سے فائق تھے۔ اُنہوں نے اپنے زورِ بیان اور عقلی دلائل سے اعدائے اسلام کو شکست دی اور اپنے دور کے علوم کے مطابق قرآنِ حکیم کی عقلی تفسیر پیش کر کے دشمنانِ اسلام کی زبانیں گنگ کر دیں۔

معتزلہ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھ کر ملک کے اطراف واکناف میں پھیلا دیں۔ اِس طرح اسلامی فکر دور دراز گوشوں تک پہنچ گیا۔ معتزلہ کو ایک فرقہ کی حیثیت بعد میں دی گئی۔ یہ درحقیقت وہ مسلمان تھے جو دین کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرنے کا جذبہ لے کر اُٹھے تھے۔

جبر و قدر کے مسئلہ کو، اعتزال کا اولین مسئلہ سمجھنا چاہیے۔ ملوکیت میں عوام جن مظالم کا شکار تھے اُنہیں جائز ثابت کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے یہ دلیل پیش کی جاتی تھی کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اُسے اپنے کسی فعل پر اختیار نہیں جو کچھ وہ کرتا ہے اُس کا ذمہ دار خود انسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہر آدمی کی تقدیر لکھ دی گئی ہے۔ سب سے پہلے معبد جہنی نے اس مسئلہ کی تردید کی اور انسان کو اپنے افعال پر مختار تسلیم کیا۔ اس طرح مذہبِ قدر کی بنیاد پڑی۔ معبد علانیہ حکومت کی مخالفت کرتا تھا، اس لیے عبدالملک بن مروان نے ۸۰ھ میں اُسے حجاج کے ہاتھوں قتل کرا دیا۔

معبد کے بعد غیلان دمشقی نے اِس مذہب کو اپنایا۔ اور چند اَور مسائل بھی مذہبِ اعتزال میں شامل کر لیے جن میں سے امر بالمعروف کا مسئلہ حکومت کے لیے انتہائی پُرخطر مسئلہ تھا۔ آخر ہشام بن عبدالملک نے ۱۰۵ھ میں اُسے دمشق بلا کر پھانسی دے دیا۔

لیکن مذہبِ اعتزال کو اب سینکڑوں لوگ قبول کر چکے تھے اور اس کے اصول بھی مرتب ہو گئے

تھے سنہ ۸۰ھ میں عمرو بن عبید اور واصل بن عطا پیدا ہوئے جنہیں مذہب اعتزال کا رکن رکین کہنا چاہیے۔ دونوں صاحب فضل و کمال تھے۔ ان کی نکتہ آفرینیوں سے اعتزال کو بہت عروج ملا حتیٰ کہ یزید بن ولید بن عبدالملک نے علانیہ یہ مذہب قبول کیا۔ جب ولید بن یزید عیاشیوں میں ڈوب گیا تو یزید نے مذہب اعتزال کے پانچویں اصول امر بالمعروف پر عمل پیرا ہو کر بغاوت کا علم بلند کیا۔ اور ہزاروں معتزلہ اُس کے ساتھ ہو گئے۔ ولید قتل ہو گیا اور یزید کو فتح حاصل ہوئی۔ اب گویا اعتزال کے قدم تختِ سلطنت پر بھی پہنچ گئے۔ سنہ ۱۳۲ھ میں خلافت بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

عباسی خاندان کا دوسرا بادشاہ منصور اگرچہ کسی مذہب سے منسوب ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ عمرو بن عبید اس کا بچپن کا ساتھی تھا دونوں نے ایک مدت تک اکٹھی تعلیم حاصل کی تھی اس کے علاوہ وہ عمرو بن عبید کی حق گوئی، جرأتِ ایمانی اور زہد و قناعت کا بھی معترف تھا اس لیے اس کے زمانہ میں معتزلہ کو بہت عروج حاصل ہوا۔

منصور کے بعد مہدی نے مذہبی آزادی کو روک دیا۔ اس کے بعد ہارون الرشید تخت نشین ہوا وہ خود تو فلسفہ و حکمت سے ناواقف تھا لیکن دربار برامکہ کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے اعتزال کو عروج نصیب ہوتا گیا۔ ہارون کے بعد مامون آیا تو معتزلہ کی بن آئی۔ کیونکہ اُس نے خود یہ مذہب قبول کر لیا۔ مامون خود بھی بہت بڑا فاضل تھا اور ابوالہذیل و نظام جیسے آفتاب و ماہتاب بھی اُس کے دربار میں موجود تھے اِس لیے اعتزال کا مہر اقبال نصف النہار پر چمکنے لگا۔ نظام کے بعد اُس کے فاضل شاگرد جاحظ نے بھی مذہب اعتزال کو بہت وسعت دی۔

مامون کے بعد معتصم اور واثق یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ وہ دونوں معتزلی تھے۔ مشہور معتزلی احمد بن داؤد ان کے زمانہ میں قاضی القضاۃ رہے جنہیں ایک واسطہ سے واصل بن عطا کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ ان کے زمانہ میں اعتزال کو اور زیادہ قوت حاصل ہوئی۔

واثق کے بعد متوکل نے عقلی و فکری ترقی کو روک دیا لیکن چوتھی صدی ہجری تک اس مذہب کو پوری قوت حاصل رہی۔ بڑے بڑے متکلم، مفسر اور ادیب پیدا ہوئے سب سے آخر میں ابوعلی

جبائی تھے ان کے بعد کوئی بلند پایہ امام الاعتزال پیدا نہ ہوا۔

علامہ بشاری نے چوتھی صدی ہجری میں دنیا کا سفر کیا تھا انہوں نے مندرجہ ذیل مقامات میں معتزلہ کی نسبت یہ تفصیل لکھی ہے: "سروات اور حرمین کے سواحل اور خصوصاً عمان کے تمام باشندے معتزلی ہیں۔ عراق میں حنبلیوں اور شیعوں کا غلبہ ہے تاہم معتزلہ بھی موجود ہیں۔ رقوہ کے موضع عانہ میں معتزلہ کی کثرت ہے فسطاط میں معتزلہ کا بڑا زور ہے، خراسان کے دیہات میں بھی ان کی کثرت ہے فارس اور سیرجان میں اکثر معتزلہ ہیں۔ کرمان میں تمام دنیا کی نسبت معتزلہ زیادہ ہیں"۔

چوتھی صدی ہجری میں ہی معتزلہ پر ہولناک مظالم کا سلسلہ شروع ہوگیا، محمد بن احمد (متوفی ۳۷۰ھ) جو بہت بڑے معتزلی عالم تھے پچاس سال تک گھر سے نہ نکل سکے، علامہ زمخشری جن کی تفسیر کشاف گھر گھر پھیلی ہوئی ہے معتزلی ہونے کی وجہ سے ملک میں چین سے نہ رہ سکے اور مجبوراً مکہ چلے گئے۔

ساتویں صدی ہجری میں مغلوں اور ترکوں نے بغداد اور دوسرے بڑے بڑے شہروں کو تباہ کرکے مسلمانوں کی علمی وعقلی قوتوں کا بھی استیصال کردیا اور اعتزال جیسا نازک مذہب ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ترک قلم کے بجائے تلوار کے دھنی تھے اور اعتزال جیسے دقیق مذہب کو قلم سے زیادہ مناسبت تھی اس لیے ترکوں کے مسلمان ہوجانے کے بعد بھی یہ مذہب زندہ نہ ہوسکا۔

معتزلہ کے عقائد

معتزلہ کے اجمالی تعارف کی یہ کوشش ناکام رہے گی اگر مجمل طور پر اُن کے عقائد بیان نہ کیے جائیں۔ معتزلہ کے عقائد میں یہ اصول مبادیات کی حیثیت رکھتے ہیں:۔

۱۔ توحید۔ ۲۔ عدل۔ ۳۔ قدر۔ ۴۔ وعد و وعید۔ ۵۔ المنزلۃ بین المنزلتین۔ ۶۔ امر بالمعروف۔

توحید

اگرچہ مسلمانوں کے تمام فرقے اللہ تعالیٰ کو واحد لاشریک تسلیم کرتے ہیں مگر پھر بھی خدا کے تصور میں اختلافات رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔

ظاہریہ اور مشبہہ کا مذہب ہے کہ اللہ جسمانی ہے، عرش پر متمکن ہے، اُس کے ہاتھ ہیں، چہرہ ہے۔ سرورِ کائناتؐ کے دوشِ مبارک پر اللہ نے ہاتھ رکھا اور آپؐ نے اُس ہاتھ کی ٹھنڈک محسوس کی۔

عام اربابِ روایت کے نزدیک خدا جسمانی ہے اُس کے ہاتھ ہیں منہ ہے۔ پنڈلیاں ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں ایسی نہیں جیسی ہماری ہیں۔ وہ عرش پر بیٹھا ہے۔ کرسی پر پاؤں رکھے ہیں اور کرسی ان کے بوجھ سے چرچراتی ہے۔

معتزلہ کے نزدیک خدا کی ذات زمان و مکان کی قید سے ماوراء ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے کوئی جہت نہیں جس کی طرف اشارہ کر کے کہا جا سکے کہ خدا اس طرف ہے۔ وہ مجسم نہیں۔ قرآن میں جہاں اُس کے ہاتھ اور چہرے کا ذکر آیا ہے، وہاں حقیقت نہیں بلکہ مجازاً مراد ہے کسی زمانہ میں اس قول کو کفر کا ہم پلہ خیال کیا جاتا تھا لیکن آج غالباً سب ہی لوگ اس قول میں معتزلہ سے متفق ہیں۔

صفات

توحید کے ساتھ ہی مسئلہ صفات کا تعلق ہے۔ مدتوں یہ مسئلہ باعثِ نزاع رہا۔ کہ:

ع۔ ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات

محدثین اور فقہاء کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات سے الگ اور قدیم ہیں معتزلہ کہتے تھے کہ اس طرح تو بہت سے خدا ہوئے اور تعدد لازم آیا۔ پھر ذات اور صفات کی علیحدگی میں ایک اور مشکل بھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر صفات ذات سے الگ ہوں تو کسی صفت کی غیر موجودگی میں بھی ذات باقی رہتی ہے۔ جیسے انسان کے صفات میں اگر صفت سماعت موجود نہ ہو تب بھی اُسے انسان کہا جائے گا۔ لیکن اگر خدا (فرض کرو) صفتِ خالقیت سے محروم ہو تو

اُسے خدا نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وہ دلائل تھے جن کی بنا پر معتزلہ صفاتِ ذات عین ذات سمجھتے تھے وہ اس کے استدلال میں وہ آیات پیش کرتے تھے جن سے تنزیہہ ثابت ہوتی تھی۔

عدل

توحید کے بعد اُن کا دوسرا عقیدہ تھا۔ تمام اسلامی فرقے بحیثیتِ مجموعی خدا کو عادل تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن معتزلہ اس سلسلہ میں چند خاص تشریحات سے کام لیتے تھے۔

اشعریہ کا عقیدہ تھا کہ خدا محالات کا حکم دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔ لیکن معتزلہ اس کے مخالف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ محالات کا حکم دینا عدلِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اور جب خدا عادل تسلیم نہ کیا جائے تو لامحالہ اُسے ظالم کہنا پڑے گا اور یہ اللہ کی شان کے خلاف ہے ماتریدیہ بھی اس معاملہ میں معتزلہ کے عقائد سے متاثر ہیں۔

اشعریہ یہ بھی کہتے تھے کہ کوئی چیز فی نفسہٖ نہ اچھی ہے نہ بُری، خدا جس چیز کو اچھا کہہ دے اچھی ہے جسے بُرا کہہ دے بُری ہے۔ اس کے برخلاف معتزلہ کا خیال تھا کہ خدا اُسی چیز کو اچھا کہتا ہے جو اصل میں اچھی ہو اور اُسی کو بُرا کہتا ہے جو اصل میں بُری ہو۔ ماتریدیہ نے معتزلہ کا یہ عقیدہ بھی قبول کیا ہے۔

اشعریہ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ خدا کے لیے عدل و انصاف کرنا ضروری نہیں۔ وہ چاہے تو عبادت کے عوض عذاب دے دے اور چاہے گناہ کے بدلہ میں انعام دے دے۔ معتزلہ اِس نظریہ کے بھی سختی سے مخالف ہیں۔ اور ان کا عقیدہ ہے کہ عدل و انصاف خدا کے لیے ضروری ہے۔ عبادت کے عوض عذاب اور گناہ کے عوض انعام دینا ظلم ہے۔ اور خدا ظلم نہیں کر سکتا کیونکہ ظلم نقصِ بشریت ہے اور اللہ نقائص سے پاک ہے۔ ماتریدیہ نے بھی اِسی عقیدہ کو اپنے مذہب میں شامل کر لیا۔

قدر

انسان اپنے افعال میں مجبورِ محض ہے یا مختارِ مطلق؟ یہ سوال اُس وقت سے انسانی ذہن

کے لیے وجہِ اضطراب بنا ہوا ہے جس وقت سے اُس نے سوچنا شروع کیا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو مسئلہ میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسانی افعال کی جزا و سزا مقرر کر دی ہے تو لازماً انسان مجبور نہیں۔ کیونکہ مجبور کو سزا دینا خدا کی صفتِ عدل کے خلاف ہے۔ آخر کیسے جائز ہے کہ کسی آدمی کو خود ہی چوری کرنے پر مجبور کرے اور پھر اُسے چوری کی سزا بھی دے۔ اگر عقیدۂ جبر کو تسلیم کیجیے تو قیامت اور حشر نشر سب عقائد بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس واضح بات کی بنا پر معتزلہ نے قدر کا راستہ اختیار کیا ہے اور انسان کو اپنے افعال میں مختار تسلیم کیا ہے۔ لیکن قرآن حکیم میں بعض ایسی آیات بھی ہیں جنہیں اگر سرسری نظر میں دیکھا جائے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ انسان کے افعال بھی اللہ کے پیدا کردہ ہیں اور انسان مجبور ہے۔ معتزلہ ان تمام آیات کا یہ جواب دیتے ہیں کہ انسان کو چونکہ تمام قوتیں اللہ نے عطا کی ہیں۔ اس لیے ان افعال کی نسبت اللہ کی طرف جائز ہے جیسے ہم یہ کہنے کی بجائے کہ "سورج کی گرمی گندم کے خوشوں کو پکاتی ہے"۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "اللہ گندم کے خوشوں کو پکاتا ہے"۔ بعض آیات میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ نے کفار کے دلوں پر مہریں کر دی ہیں اور وہ حق پر غور نہیں کر سکتے تو گویا اللہ نے انہیں کفر پر مجبور کر دیا ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ انسان کے ہر فعل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ انکار و جحود اور ضد و سرکشی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے کان حق کی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتے اور اُس کا ذہن صداقت کی دعوت پر غور و فکر نہیں کرتا۔ پس ختمِ قلوب اصل میں انکار و جحود کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور اس کے باوجود انسان کو اختیار ہے کہ وہ دعوتِ حق و صداقت پر فکر و تدبر کر کے اپنے دل کے قفل کھول دے۔ گویا جہاں ضد کے فعل کا نتیجہ ختمِ قلب ہے وہاں ضد چھوڑ دینے کا یہ نتیجہ بھی تو ہے کہ انسان میں حق قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آخر آیہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَ عَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَ عَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۔ کے نزول کے بعد بھی تو کفار ایمان لاتے رہے ہیں۔ پس اگر اس کا وہی مفہوم ہوتا جو جبریہ لیتے ہیں تو پھر وہ لوگ بعد میں ایمان کیونکر لاتے جبکہ اُن کے دلوں پر مہریں لگ چکی تھیں

فی الواقع ایسی تمام آیات کا مفہوم یہی ہے کہ جب تک کفار ہٹ دھرمی اور ضد پر جمے رہیں حق اُن پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اور اُن کی تقدیر یہی ہوتی ہے کہ ان کی بصارت پر باطل پردے تان دیتا ہے اور نظامِ حق کے تابناک نتائج دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن جب وہ اپنی حالت بدل لیں ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ دیں تو ظاہر ہے کہ اس فعل کے بُرے نتائج بھی خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ گویا انسان اپنی حالت بدل لے تو اُس کی تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔

رمز باریکے بحرفے مضمر است ۔۔۔ تو اگر دیگر شوی او دیگر است

شبنمی! افتندگی تقدیر تست ۔۔۔ قلزمی! پائندگی تقدیر تست

خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا ۔۔۔ سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

وعدہ وعید

معتزلہ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسن عمل کے لیے جو وعدہ، وعید بیان کی گئی ہے اُس کا نافذ ہونا ضروری ہے محض ڈراوے یا ترغیب کے لیے خدا کچھ نہیں بیان کرتا نہ وہ موج میں آکر" انسان کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور نہ غصہ میں آکر فرمانبرداریوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ مقرر ہے اور وہ مرتب ہو کر رہے گا۔ اشعریہ اس کے مخالف ہیں۔

المنزلۃ بین المنزلتین

معتزلہ سے پہلے گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو اہلِ روایت کافر کہتے تھے۔ اور مرجیہ اسے مسلمان سمجھتے تھے۔ معتزلہ نے کہا وہ نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ اس کی حالت ان دونوں کے بین بین ہے۔ اسے فاسق کہا جا سکتا ہے۔

امر بالمعروف

خوارج اس اصول کو فرض عین قرار دیتے تھے اور ہمیشہ شمشیر بکف رہتے۔ لیکن معتزلہ اسے فرض سمجھتے تھے۔ وہ تلوار اُٹھاتا اُس وقت ضروری سمجھتے جب حالات سازگار ہوتے اور سارے سامان جمع ہو جاتے۔

عقل کا غلبہ

معتزلہ عقل کی فضیلت کے قائل تھے۔ وہ عقل کو احادیث پر حاکم سمجھتے تھے۔ جو حدیث عقل و درایت کے خلاف ہوتی اُسے موضوع قرار دیتے۔ اس اصول کو وضع کرنے کا بڑا سبب غالباً اُن لوگوں کا غلو اور جمود تھا جو حدیث کے سامنے عقل کو حقیر سمجھتے تھے اور جو چیز بھی حدیث کے نام پر اُن کے سامنے پیش ہوتی وہ اسے بے تامل قبول کر لیتے۔ ان لوگوں کے جمود کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

علامہ سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ہارون کے دربار میں کسی نے یہ حدیث پڑھی کہ آدم علیہ السلام اور موسٰی علیہ السلام میں مناظرہ ہوا ایک شخص بول اُٹھا کہ آدم اور موسٰی کے زمانوں میں تو صدیوں کا بُعد ہے۔ پھر وہ اکٹھے کیونکر ہوئے اور مناظرہ کیسے چھڑ گیا۔ ہارون جو محدثین کا ہم خیال تھا اس قدر برہم ہوا کہ اس شخص کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔

فریقین کا تشدد

معتزلہ نے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی تو محدثین نے نہایت زور شور سے اس کی مخالفت کی۔ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ، سفیان ثوری اور تمام اہلِ حدیث نے اس علم کا حصول حرام قرار دے دیا۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

"والی التحریم ذھب الشافعی و مالک و احمد بن حنبل و جمیع اھل الحدیث من السلف" (احیاء علوم الاسلام)

امام شافعیؒ کہتے تھے کہ متکلمین کو درّے لگانا چاہییں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول تھا کہ متکلمین زندیق ہیں۔ معمولی معمولی اختلافات میں تشدد کا یہ عالم تھا کہ فریقین ایک دوسرے کو کافر ٹھہراتے تھے۔

اختلافی مسائل میں ایک یہ بھی تھا کہ قرآن قدیم ہے یا مخلوق و حادث؟ معتزلہ کہتے تھے کہ خدا کی صفت تکلم قدیم ہے لیکن جو الفاظ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتے تھے وہ مخلوق

وحادث تھے۔ محدثین کلام اللہ کو ہر حال میں قدیم تسلیم کرتے تھے۔ زیادہ غور و تفحص سے کام لیا جائے تو دونوں کا حاصل ایک ہی ٹھہرتا ہے لیکن فریقین نے اس مسئلہ کو کفر و اسلام کی حد فاصل قرار دے دیا۔ اور تشدد اس انتہا کو پہنچا کہ جعد بن درہم کو کوفہ کے والی خالد بن عبداللہ القسری نے اس جرم کی پاداش میں گرفتار کر کے عید قربانی کے موقع پر حصول ثواب کی نیت سے ذبح کیا اور جب معتزلہ کو موقع ملا تو محدثین کو سخت سزائیں دی گئیں ۔ حتٰی کہ مامون کا زمانہ محدثین کے لیے ایک عبرت ناک دور ابتلار ثابت ہوا۔ مگر متوکل کے زمانہ میں محدثین نے بھی بڑھ چڑھ کر معتزلہ سے انتقام لیا۔

کیا معتزلہ کافر تھے؟

ایک عرصہ تک معتزلہ کو کافر سمجھا جاتا رہا لیکن جب فضا ذرا پُرسکون ہوئی اور معتزلہ کی علمی خدمات پر نظر ڈالی گئی تو محققین نے انہیں کافر کہنے سے انکار کر دیا۔

علامہ جلال الدین دوانی لکھتے ہیں:

"رہے معتزلہ تو صحیح یہی ہے کہ وہ کافر نہیں ہیں"۔ (شرح عقائد عضدی)

مشہور محدث علامہ تقی الدین سبکی لکھتے ہیں:

"یہ دونوں گروہ اشعریہ اور معتزلہ برابر کے جوڑ ہیں اور دونوں متکلمین کے سرگروہ ہیں اور اشعریہ زیادہ اعتدال پر ہیں"۔ (شرح احیاء الاسلام)

علامہ رازی فرماتے ہیں:

"میرے والد ماجد، شیخ القاسم انصاری کا یہ قول بیان کیا کرتے تھے کہ اہل سنت کا خیال خدا کی قدرت کی وسعت پر ہے اور معتزلہ کی نظر خدا کی تعظیم اور مبرا عن العیوب ہونے پر ہے، اس لیے غور سے دیکھو تو دونوں خدا کی عظمت و تقدیس کے معترف ہیں۔ البتہ اس قدر ہے کہ کسی نے غلطی کی اور کوئی صائب الرائے ٹھہرا"۔ (تفسیر کبیر۔ سورۂ الانعام)

مشہور محدث امام نووی فرماتے ہیں:

"سلف و خلف کا اس پر برابر اتفاق رہا کہ معتزلہ وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے"۔
(فتح المغیث ص۱۳۱)

فقہی حیثیت سے معتزلہ اکثر حنفی المذہب ہوتے تھے۔ طبقات الحنفیہ میں جہاں اُن کے نام آتے ہیں تو اُن کا تذکرہ بھی اُسی عظمت وشان سے کیا جاتا ہے، جس طرح دوسرے علمائے حنفیہ کا۔ علامہ زمخشری مشہور معتزلی ہیں۔ ان کی تفسیر کشاف ادب، عربیت، معانی اور بلاغت کی بے مثال خوبیوں کے باعث آج تک نصاب میں داخل ہے۔ ان کے متعلق طبقات الحنفیہ میں لکھا ہے کہ "من اکابر الحنفیۃ"۔ یعنی وہ اکابر حنفیہ میں سے تھے۔ فن بلاغت کے تمام ارکان یعنی جاحظ، سکاکی اور عبد القادر جرجانی معتزلی تھے۔

معتزلہ نے اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق قرآن حکیم کی عقلی تفسیر پیش کی اور ثابت کر دیا کہ قرآن حکیم میں جو کچھ مذکور ہے علم و عقل کے مطابق ہے۔ معتزلہ مفسرین میں سے ابو مسلم اصفہانی، ابو بکر اصم، ابو القاسم بلخی، علّامہ زمخشری اور قفال کبیر بہت معروف ہیں۔

ابو مُسلِم اصفہانیؒ

ابو مسلم کا نام محمد بن بحر اصفہانی ہے۔ علّامہ ذہبی نے محمد بن علی بن مہر یزد لکھا ہے۔ کنیت ابو مسلم تھی۔ مؤرخ حمزہ کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش ۲۵۴ھ میں ہوئی۔ اور وفات ۳۲۲ھ میں۔ صاحب طرز ادیب ہونے کے علاوہ بلند پایہ مفکر بھی تھے۔ ابن الندیم نے انہیں مشہور بلغاء میں شمار کیا ہے۔ الفہرست کے الفاظ ہیں: "کان کاتبًا مرسلًا بلیغًا متکلمًا جدلیًا"۔

وزیر ابو الحسن علی بن عیسٰی بن داؤد بن جراح کو ان سے بڑی محبت تھی۔ ابو علی زید التنوخی لکھتے ہیں: "محمد بن زید الداعی نے ذکر کیا کہ ابو مسلم معتزلی صرف مفسر قرآن ہی نہ تھے بلکہ اپنے زمانہ کے دوسرے علوم میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ گوشہ نشین عالم ہی نہ تھے اعلیٰ درجہ کے

منتظم بھی تھے۔ چنانچہ وہ اصفہان کے ناظم مقرر ہوئے اور اس کے بعد خلیفہ مقتدر نے انہیں فارس میں اپنا نائب مقرر کر دیا تھا۔ وہاں نیابت کا کام بحسن و خوبی انجام دیتے اور خلیفہ کو وہاں کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔"

انتظامی امور میں جب انھوں نے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کیا تو ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ چنانچہ سنہ ۳۰۰ھ میں جب ابن ابی البغل کو صوبہ اصفہان کی مالیات اور اراضی کا انچارج بنایا گیا تو اس نے ابومسلم کو خط لکھ کر بلایا اور اصفہان میں اراضی کا ناظم مقرر کر دیا۔ جب ابن ابی البغل خود اصفہان آیا تو ان کے کام کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوا کہ انہیں اپنی نیابت کے عہدہ پر مستقل کر دیا۔ جب سنہ ۳۲۱ھ میں ابو علی محمد بن رستم کی وفات ہوئی تو ابومسلم کو اس کی جگہ مل گئی۔

شوال سنہ ۳۲۱ھ کا ذکر ہے کہ علی بن بویہ پانچ سو سواروں کا دستہ لے کر فارس پر حملہ آور ہوا۔ مظفر بن یاقوت نے پانچ ہزار کی فوج سے اس کا مقابلہ کیا مگر شکست کھا گیا۔ ابن بویہ ذی القعدہ کی پندرہ تاریخ کو اصفہان میں فاتحانہ داخل ہوا اور ابومسلم کو معزول کر دیا۔

ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں ابومسلم کی مندرجہ ذیل کتب کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ جامع التاویل لمحکم التنزیل۔ یہ قرآن حکیم کی تفسیر تھی بعض کہتے ہیں چودہ جلدوں میں تھی۔ صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق تیرہ جلدوں میں تھی۔ مورخ حمزہ نے لکھا ہے کہ اس تفسیر کا نام شرح التاویل تھا۔ افسوس ہے کہ آج علمی دنیا اس بلند پایہ تفسیر سے محروم ہے۔ آج اس کا وجود کہیں نہیں ملتا۔ اس تفسیر کی عظمت و مرتبت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ صاحب تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں جہاں کہیں ابومسلم کے اقوال نقل کرتے ہیں، کہیں اشارۃً ان اقوال کی تائید کرتے ہیں اور کہیں کھل کر ابومسلم کی تعریف کرتے ہیں۔ قصۂ سامری میں ابومسلم کے تفسیری نکات نقل کر کے اسے ترجیح دیتے ہیں اور پھر اس کی تائید میں

اپنی طرف سے دلائل بھی بیان کرتے ہیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق "قَالَ رَبِّ اجْعَل لِّي آيَةً" کے تحت ابومسلم کا قول نقل کرتے ہیں اور پھر فرطِ عقیدت سے جھوم جھوم کر لکھتے ہیں۔

و هذا القول عندی حسنٌ معقول وابومسلم حسن الکلام فی التفسیر کثیر الخوض علی الدقائق واللطائف۔	اور یہ قول میرے نزدیک احسن اور معقول ہے۔اور ابومسلم کا کلام تفسیر میں نہایت معقول ہوتا ہے۔ وہ دقیق اور لطیف باتوں کو تہ سے ڈھونڈھ کر نکالتا ہے۔

بیشتر مسائل میں معتزلہ نے انفرادیت اختیار کی اور اُن کے اقوال کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ ابو ہلال عسکری کتاب الاوائل میں بہت سی اولیات شمار کرتے ہیں تو اکثر معتزلہ کا نام لیتے ہیں۔ مثلاً یہ جو آپ کے ہاں مسائل فقہیہ کے چار ماخذ قرآن، حدیث، اجماع، قیاس تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہ سب سے پہلے مشہور معتزلی واصل بن عطاء نے بیان کیے تھے۔ "عام و خاص" کی اصطلاح بھی اسی کی وضع کردہ ہے۔ یہ مسئلہ کہ نسخ احکام میں ہوسکتا ہے نہ کہ اقوال میں پہلے پہل اسی نے بیان کیا۔

ابومسلم بھی بیشتر مسائل میں منفرد ہیں اور ان کے اقوال کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"بہت سے مسائل میں ابومسلم منفرد تھے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ناسخ منسوخ ہونے کے وہ قطعاً منکر تھے۔ امام رازی تمام ان آیتوں کی تفسیر میں جن کو لوگوں نے منسوخ مانا ہے۔ ابومسلم کا قول اور ان کی توجیہہ نقل کرتے ہیں اور ہر جگہ ان کے طرزِ بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ابومسلم کی رائے سے متفق ہیں۔"

(علم الکلام ص۴۲)

ہمارے بیشتر مفسرین نے اکثر مقامات پر ابو مسلم کے اقوال سے ہی اپنے ذوق کو تسکین دی ہے۔ سر سید مرحوم اکثر جگہ ابو مسلم کا نام لے کر اُن کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں ابو مسلم کے اقوال لیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابو مسلم کی تفسیر اگر آج موجود ہوتی تو وہ علمی دنیا کے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ قرار پاتی۔

۲۔ جامع رسائلہ۔ یہ ابو مسلم کی دوسری کتاب ہے۔ اس کا ذکر مؤرخ حمزہ نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔

۳۔ کتاب الناسخ والمنسوخ۔ یہ وہ کتاب تھی جس نے ابو مسلم کو زندہ جاوید بنا دیا۔ مفسرین میں پہلا مفسر ابو مسلم ہے جس نے قرآن میں "ناسخ منسوخ" تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ آج یہ مسئلہ بہت سے مفسرین نے تسلیم کر لیا ہے۔ مگر اُس زمانے میں اسے بہت اجنبی سمجھا گیا تھا۔ آج وہ کتاب موجود نہیں مگر علامہ رازی نے اپنی تفسیر میں اُن آیات کے متعلق ابو مسلم کے اقوال نقل کیے ہیں جنہیں مفسرین منسوخ ٹھہراتے تھے۔ ہم نے زیر نظر کتاب میں "ناسخ منسوخ" کے عنوان سے اُن اقوال کو یک جا کر دیا ہے۔

۴۔ کتاب فی النحو۔

ان کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی اس وقت دنیا میں موجود نہیں۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کتابیں کس پایہ کی ہوں گی۔

غرض ابو مسلم ایک اعلیٰ درجہ کے منتظم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک عظیم المرتبت ادیب، شاعر اور فنِ نحو کے ماہر تھے۔ یہ تمام حیثیات بمشکل ہی کسی فردِ واحد میں جمع ہو سکتی ہیں لیکن اس وقت اُن کی جس فضیلت سے تعلق ہے وہ تفسیر قرآن سے متعلق ہے جس کی مثالیں آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئیں گی۔ اس مقام پر اس فضیلت کو ایک بار پھر دُہرا دینا ضروری ہے کہ ابو مسلم کی تفسیر سے مراد یہ ہے کہ اس میں قرآن کریم کے حقائق کو اس زمانے کی علمی سطح کے مطابق پیش کیا

گیا ہے ۔ اور وہ زمانہ آج سے ہزار سال پہلے کا تھا ۔ اِس دوران میں انسانی علم کی سطح جس قدر بلند ہو چکی ہے وہ ظاہر ہے ۔ اِس لیئے اگر ابو مسلم کا کوئی علمی نکتہ اگر آج کی علمی تحقیق کے معیار پر پورا نہیں اُترتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانے کی علمی سطح آج کی سطح سے نیچے تھی ۔ اِس لیے اس سے ابو مسلم کی قابلیت پر کوئی حرف نہیں آتا ۔ نہ ہی اس کی تفسیر کو حرفِ آخر کی حیثیت حاصل ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ حرفِ آخر صرف خدا کا کلام ہے ۔ کسی انسان کی کوئی تحقیق حرفِ آخر کہلا نہیں سکتی ۔ ہمیں اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ کو اس نگاہ سے دیکھنا چاہیے ۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اس سرمایہ کے درخشندہ موتیوں کو اپنی وراثت سمجھ کر دامن میں سمیٹ لیں گے ۔ اور ان کی جن باتوں میں کوئی نقص ہوگا اُنہیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں گے

وما توفیق الا باللہ العلی العظیم ۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

ایمان بالغیب

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ جو ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ (بقرہ - ۱)

متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے جس صفت کو اولیت کا درجہ عطا ہوا وہ یہی ہے کہ متقی ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ عام مفسرین کا خیال ہے کہ "غیب" سے مراد وہ تمام اشیاء ہیں جو حواس ظاہریہ و باطنیہ سے ماوراء ہیں اور ہم کسی ذریعہ سے اُن کا ادراک نہیں کر سکتے۔ مثلاً خدائے قدوس کی ذات، ملائکہ، روز قیامت، کتب سماویہ اور پیغمبرانِ خدا کی رسالت، یہ وہ حقائق ہیں جن کا ادراک ہماری عقلی و فکری کاوشوں سے ماوراء ہے۔ ہماری کوئی کوشش بھی ان عظیم رازوں کی نقاب کشائی نہیں کر سکتی۔ اس لیے خدا اپنے انبیاء کے توسط سے نسلِ انسانی کی راہنمائی کے لیے ان حقیقتوں سے چلمن سرکاتا ہے۔ گویا متقی وہ ہیں جو متذکرہ اشیاء کی اطلاع پاکر ان کی تصدیق کرتے ہیں اور اپنے اخلاق و کردار کو اُن کے مطابق ڈھالتے ہیں۔

ابومسلم اصفہانی کو اس تفسیر پر کئی اعتراضات ہیں۔

پہلا اعتراض

اس مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے خدائے قدوس نے ارشاد فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر اُتارا

بِالْیٰتِ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۔ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ

گیا ہے اور اُس پر جو آپ سے قبل اُتارا گیا اور قیامت پر یقین رکھتے ہیں ۔

ان آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ متقی نبوت، وحی اور آخرت کا اقرار کرتے ہیں اگر "الغیب" کے لفظ میں بھی ان چیزوں کا مفہوم پنہاں تھا تو پھر ان ہی چیزوں کا اعادہ محض بے ضرورت تھا۔ اس طرح تو معطوف اور معطوف علیہ ایک ہی چیز ہوئے ۔ اور یہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں

دوسرا اعتراض

مفسرین کے بیان کے مطابق اگر "الغیب" سے خدا کی ذات، پیغمبرانِ خدا کی رسالت، ملائکہ، یوم قیامت اور کتب سماویہ ہی مراد ہوں تو انسان کو ان امور کا علم حاصل ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو غیب کا علم حاصل ہے۔ لیکن یہ عقیدہ نصِ صریح وعندہٗ مفاتیح الغیب لا یعلمہا الا ھو (اور غیب کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں۔ اُس کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا) کے مخالف ہے۔ اس لیے صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔

تیسرا اعتراض

جس چیز پر "حاضر" کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ اُسے "غیب" نہیں کہا جاسکتا۔ پس اس صورت میں ہم لفظ "غیب" کا اطلاق اللہ اور اُس کی صفات پر نہیں کر سکتے ۔ اس حاضر و موجود ہستی کو اگر غیب کہہ دیا جائے تو یہ کتنی مضحکہ خیز تعبیر ہوگی ۔ اور اگر اللہ کو لفظ "الغیب" کے مفہوم میں شامل نہ سمجھا جائے تو ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت ہی باقی رہ جائیں گے۔ حالانکہ ایمان کا رکنِ اول ایمان باللہ ہے اور جب اس کو خارج کر دیا جائے تو ایمان کا مفہوم ہی فوت ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ہم پہلے کہہ چکے ہیں اگر ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کا ذکر مقصود ہوتا تو پھر عطف لگا کر انہی چیزوں کی تکرار بے معنی تھی۔

یہ ہیں وہ اعتراضات جن کی بنا پر ابو مسلم اصفہانی ایمان بالغیب کی تفسیر میں پرانی ڈگر سے ہٹ کر نیا راستہ نکالتے ہیں۔

الغیب - اصل میں مصدر ہے مگر اسم فاعل کا قائم مقام استعمال ہوا ہے جس طرح "صوم" "صائم" اور "زور" "زائر" کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اسی طرح "غیب" "غائب" کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اب آیت کا مطلب صاف ہے کہ مومن چاہے لوگوں کے سامنے ہوں یا اُن کی نگاہوں سے غائب وہ ہر حال میں اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُن کی حالت منافقوں کی سی نہیں کہ

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۔ (البقرہ - ۱۰)

جب ایمان والوں سے ملے تو کہہ دیا کہ ہم بھی ایمان لائے اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملاقات ہوئی تو بول اُٹھے ہم تمہارے ساتھی ہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ہم ان سے مذاق کر رہے تھے۔

اور یوں بھی الغیب جب "ب" کے صلہ کے ساتھ (بالغیب بن کر) آئے تو حاضر نہ ہونے اور موجود نہ ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے۔

ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ ۔

یہ اس لیے تاکہ وہ جان لے کہ میں نے اُس کی عدم موجودگی میں اُس کی خیانت نہیں کی۔

اس آیت میں بالغیب کا لفظ عدم موجودگی کے معانی دے رہا ہے۔ اس لیے آیۂ زیر بحث میں بھی اس کا یہی مفہوم لینا ہوگا اور اس طرح آیت کی صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ مسلمانوں کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے وہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں ہر حال میں ایمان دار ہوتے ہیں اُن کی حالت منافقین کی سی نہیں کہ کفار سے ملے تو اُنہیں اپنی رفاقت کا یقین دلایا اور مسلمانوں سے ملاقات ہوئی تو اُن کی ہمدردی کا دم بھرنے لگے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ دونوں حالتوں میں جھوٹے ہیں۔ کفار کے ساتھی ہیں نہ مسلمانوں کے رفیق۔ وہ تو محض اپنے مفاد کے پرستار ہیں جہاں سے فائدہ نظر آئے گا اُدھر ہی جھک پڑیں گے۔ اس طرح اُن کی زبان اُن کے دل کی ترجمان نہیں۔

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۔

اپنی زبانوں سے ایسی باتیں نکالتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔

سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات کے نفسِ مضمون سے بھی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ ان آیات میں تین مختلف گروہوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ مومن، کافر اور منافق ـــــ سب سے پہلے مسلمانوں کی تعریف کی گئی اور ان کی صفات بیان کی گئیں۔ پھر اپنی ہٹ پر ڈٹ جانے والے کفار کا ذکر ہوا کہ حقائق و معارف کے دریا بہ جائیں مگر ان کے قلوب و اذہان پر ایسے قفل پڑے ہیں کہ دعوتِ حق و صداقت پر کان ہی نہیں دھرتے۔ پھر تیسرے گروہ کا ذکر چھڑا جسے قرآن منافقین کا گروہ قرار دیتا ہے۔ مومن اور کافر میں یہ چیز تو مشترک ہے کہ ان کی زبان اُن کے قلبی جذبات کا اظہار کرتی ہے۔ مومن اگر مومن ہے تو وہ ہر حال میں اپنی ایمانداری کا اعلان کرتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی کی شکن آلود پیشانی یا دولت کی فراوانی کو دیکھ کر مرعوب ہو جائے اور ایسی باتیں منہ سے نکالے جن کا ادنیٰ سا تصور بھی اس کے دل میں موجود نہ ہو۔ اسی طرح کفار بھی اگرچہ انکار و جحود کی روش پر قائم ہیں۔ مگر اپنی حالت کسی وقت بھی نہیں چھپاتے۔ ان کا دل اگر حق و صداقت کو قبول نہیں کرتا تو اُن کی زبان بھی دین اسلام کے خلاف کھلتی ہے۔ مگر یہ تیسرا خطرناک گروہ ہے کہ اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں، موسم اور ماحول کے اشارے پا کر رنگ بدلتے ہیں مسلمانوں کے سامنے ہوں تو دین کی حمد و ثنا میں اُن کی زبانیں ڈوبی رہیں گی اور نظروں سے اوجھل ہوں گے تو اسی دین کا مذاق اُڑائیں گے ـــــ اسی طرح گویا الایمان بالغیب کے الفاظ مومنوں اور منافقوں کا فرق واضح کرنے کے لیے ہیں۔

یَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ کا مفہوم

وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ - (۲/۱۵)	اور وہ اُنہیں ڈھیل دے رہا ہے تو وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں ہو رہے ہیں۔

جبریہ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ منافقین کو اُن کے طغیان میں ڈھیل دیتا ہے اِس لیے وہ اور زیادہ بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ گویا خدا کا ارادہ یہی ہے کہ وہ راہِ راست پر نہ آئیں۔ لیکن ابو مسلم اسے اپنے مسلک (قدر) کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ

طغیان کی اضافت چونکہ نافرمانوں کی طرف ہے اس لیئے ظاہر ہے کہ سرکشی پر اللہ نے انہیں مجبور نہیں کیا بلکہ یہ اُن کا اپنا فعل ہے۔ اگر خدا اُنہیں اس فعل پر مجبور کرتا تو اس کی اضافت خدا کی طرف ہوتی ہے۔ دوسری جگہ "مد" کے لفظ کی نسبت شیاطین سے کی گئی ہے۔

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ — اُن کے بھائی بند گمراہی میں اُن کی مدد کرتے ہیں۔

پہلی آیہ میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ گمراہی میں اُن کی مدد کس طرح کرتا ہے؟ بظاہر یہ سوال بڑا وقیع معلوم ہوتا ہے مگر غور کیجیے تو مطلب واضح ہے کہ چونکہ اللہ نے اُنہیں اپنے اعمال پر اختیار دیا ہے اس لیے جو لوگ گمراہی کی راہوں پر چل پڑتے ہیں یوں نہیں ہوتا کہ انہیں اپنی بداعمالیوں کی فوراً سزا مل جائے اگر ایسا ہوتا تو یہ زندگی امتحان نہ ہوتی بلکہ نیکی اور ہدایت کی راہیں اختیار کرنے کے لیے مجبوری کا پھندا بن جاتی۔ مگر خدائے قدوس نے حیاتِ انسانی کو آزمائش قرار دیا ہے (لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) اور جو لوگ کفر اختیار کرتے ہیں اُنہیں ایمان لانے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ اُنہیں پوری آزادی اور خود مختاری عطا کرتا ہے۔ وہ اس ڈھیل کے باعث اس زعم باطل میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ بھلے کام کر رہے ہیں۔ وہ کفر پر ڈٹے رہتے ہیں اور اُن کی قلبی و روحانی تاریکی بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح حق پرست اعمالِ حسنہ کی راہوں پر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہی قوانین کو اپنی مدد شمار کرتا ہے اور اسی مدد کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرتا ہے کیونکہ اس کے اسباب پیدا کرنے والا وہ خود ہے۔ کیمبی بھی ابو مسلم سے متفق ہیں۔

یہ اشکال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ دوسری آیت وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ میں کہا گیا ہے کہ اس ضلالت میں شیاطین اُن کی مدد کرتے ہیں۔ اور آیۂ زیرِ بحث میں کہا گیا کہ ان کی ضلالت میں خود خدا ان کی مدد کرتا ہے۔ چونکہ ایک ہی فعل کو شیاطین سے بھی منسوب کیا گیا اور پھر اُسی کو اپنی ذات سے بھی نسبت دی گئی۔ اس لیئے تعارض لازم آیا۔ لیکن سوچیے تو یہ کوئی ایسا بڑا اشکال نہیں کیونکہ گمراہ کرنے میں تو شیاطین اُن کی مدد کرتے ہیں اور اس گناہ کی فوراً سزا نہ دے کہ اللہ انہیں ڈھیل دیتا ہے۔ اس لیے اس مدد کی نسبت دونوں کی طرف جائز ہے۔ جس طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سورج

فصل پکاتا ہے اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا فصل پکاتا ہے۔

تقدیس

وَ نُقَدِّسُ لَکَ (۲/۴) — اور ہم تیری تقدیس کرتے ہیں۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ ہم اپنے اعمال و افعال کو خطاؤں کی آلائش سے پاک رکھتے ہیں تاکہ وہ خالصتاً تیرے لیے ہوں اور ان میں شرک کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ پایا جائے۔

ظُلم

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۞ (۲/۵۱)

اور جب ہم نے موسیٰؑ سے وعدہ کیا چالیس راتوں کا پھر پکڑا تم نے گائے کا بچہ پیچھے اس کے اور تم ظالم تھے۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

لغت میں ظلم نقص (کمی کرنے) کو کہتے ہیں کتاب اللہ میں ہے۔

وَ کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُکُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَیْئًا

اور دونوں باغوں نے پھل دیے اور کچھ بھی کمی نہ ہوئی۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب اُنہوں نے مارنے اور جلانے والے خالق کو چھوڑ کر بچھڑے کو معبود بنالیا تو دین اور دنیا کی بھلائیوں میں ناقص ہو گئے۔

قریہ سے کون سی بستی مراد ہے؟

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ (۲/۵۸)

اور جب ہم نے اُنہیں کہا اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔

قریہ کا تعین کرنے میں مفسرین مختلف الرائے ہیں۔ ابن عباسؓ اور ابو زیدؒ کے نزدیک قریہ

سے مراد وہ گاؤں ہے جس کا نام ریحار تھا۔ اور جو بیت المقدس کے قریب تھا۔ ابومسلم صفہانی، قتادہ اور ربیع کا خیال ہے کہ قریہ سے بیت المقدس ہی مراد ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ اس حکم کو بیان کرتے ہوئے اللہ نے قریہ کی بجائے ارضِ مقدس کا لفظ خود ہی ارشاد فرمایا ہے۔

اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ — ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے

الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (سورہ مائدہ) — تمہارے لیے لکھ دی ہے۔

چونکہ دونوں آیتوں میں ایک ہی حکم بیان ہوا ہے، اس لیے قریہ سے بیت المقدس ہی مراد ہوگا۔

ابن عباسؓ اور ابو زید کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ اس حکم کے بعد کی آیت فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا میں ف تعقیب کے لیے آئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ قریہ میں داخل ہونے کے حکم کے متّابعد حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں انہوں نے قول بدل دیا لیکن موسیٰؑ صحرائے تیہ میں وفات پاگئے اور وہ بیت المقدس میں داخل نہ ہوئے اس لیے اس قریہ سے بیت المقدس قطعاً مراد نہیں ہو سکتا۔

ابومسلم اس اشکال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ سورۂ مائدہ میں بیت المقدس میں داخل ہونے کا جہاں حکم دیا گیا ہے وہاں صاف بتایا گیا ہے کہ بزدل بنی اسرائیل اس بستی میں داخل نہ ہوئے اور اللہ نے چالیس سال تک وہ بستی ان پر حرام کردی اور وہ صحراؤں میں سرگرداں پھرتے رہے۔ سورۂ بقرہ کی ان آیات میں بنی اسرائیل کی جو فردِ جرم مرتب کی گئی ہے وہ کسی مخصوص زمانہ سے متعلق نہیں بلکہ مختلف زمانوں کے جرائم بیان کیے گئے پس یہاں جو ف آئی ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ یہی حکم حضرت یوشعؑ کی زبانی پھر دہرایا گیا اور تب "تبدیلِ قول" کا واقعہ پیش آیا۔

حِطَّةٌ کا صحیح مفہوم

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا — اور داخل ہو دروازے میں سجدے کرتے ہوئے

وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (۲/۵۸)

اور کہو بخشش مانگتے ہیں ہم بخشیں گے ہم واسطے تمہارے خطائیں تمہاری اور البتہ زیادہ دیں گے ہم نیکی کرنے والوں کو۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

عام مفسرین کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل کو حطہ۔ حطہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا جس کا مطلب "ہم بخشش مانگتے ہیں" لیا جاتا ہے۔ لیکن ابو مسلم کے نزدیک اس کا یہ مطلب ہے کہ انہیں حکم دیا گیا کہ عاجزی و انکساری سے شہر میں داخل ہو جاؤ۔ اور کہتے جاؤ "اے اللہ ہم اس بستی پر چھا جائیں اور تو ہمیں اس میں ٹھکانا عطا فرما" یعنی حطہ چھا جانے کے معنی میں آیا ہے۔ قاضی نے اس قول کی مخالفت کی ہے اس کا یہ خیال ہے کہ اگر حطہ کا یہی مفہوم ہوتا تو پھر اس کے ساتھ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ کا کیا تعلق تھا۔ یہ الفاظ "کہ تم حطہ کہو اور ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے" اس مفہوم پر دلالت کرتے ہیں کہ حطہ سے بخشش مانگنا ہی مراد ہے۔

قاضی کے اس اعتراض کا ابو مسلم کی طرف سے علامہ رازی یہ جواب دیتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا کہ "تم سجدہ کرتے ہوئے یعنی خدا کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے عاجزی اور فروتنی سے شہر میں داخل ہو جاؤ اور کہتے جاؤ" اے اللہ ہمیں اتنی قوت عطا کر کہ اس بستی پر چھا جائیں اور ہمیں اس میں ٹھکانا عطا فرما" اس میں خطاؤں کی بخشش کا تعلق اس وجہ سے ہے کہ جب وہ پوری انکساری کے ساتھ فرمانِ الٰہی کی تعمیل کریں گے تو اللہ اُن کی پچھلی خطاؤں سے درگذر فرمائے گا۔

قول کی تبدیلی

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○ (۲/۵۹)

مگر ان زیادتی کرنے والوں نے جو انہیں بتایا گیا تھا اُسے بدل ڈالا سو ہم نے ان زیادتی کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا کیونکہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

اکثر مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ تبدیل قول سے مراد لفظی تبدیلی ہے اور بنی اسرائیل حطہ کے بجائے حنطہ (گندم) کہنے لگے تھے اس لیے ان پہ طاعون کا عذاب نازل ہوا۔

ابو مسلم کے نزدیک تبدیلِ قول سے مراد لفظی تبدیلی نہیں بلکہ نافرمانی اور عملی مخالفت ہے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ (جب تم فتوحات سے حاصل کیے ہوئے مال کی طرف جاؤ گے تاکہ اُسے لوٹو پیچھے رہے ہوئے لوگ کہیں گے ہمیں چھوڑ دو تاکہ ہم تمہاری پیروی کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں۔)

ان کا کلامِ الٰہی کو تبدیل کرنا عملی لحاظ سے تھا نہ یہ کہ وہ الفاظ میں کوئی تبدیلی کرتے تھے۔ پس یہاں بھی یہی صورت ہے۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ انھوں نے اللہ کے احکام کی عملاً خلاف ورزی کی اس لیے انہیں اس کی سزا بھگتنی پڑی۔ آیت کے آخر میں فسق کا لفظ استعمال کر کے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ عملاً خدا کی نافرمانی کرتے تھے۔

استسقاء

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ (۲/۶۰)　　　اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا

عام مفسرین کا خیال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے پانی کی درخواست صحرائے تیہ میں کی تھی، کیونکہ جب اللہ نے اُن پر ابر رحمت کا سایہ کیا اور اُن کی خوراک کے لیے من و سلویٰ کا نزول ہوا اور ایسا لباس عطا فرمایا کہ نہ وہ پُرانا ہوتا تھا اور نہ پھٹتا تھا، اُس وقت انہیں پیاس کا خوف ہوا اور موسیٰ کی درخواست پر اللہ نے پتھر سے پانی نکال دیا۔

لیکن ابو مسلم اصفہانی کے خیال میں یہ واقعہ صحرائے تیہ میں نہیں ہوا۔ بلکہ یہ الگ قصہ ہے۔ اور استسقاء کے معانی عام عادت کے مطابق بارش مانگنے کے ہیں۔ اللہ نے اُن کی دعا

قبول کرکے بارش بھی برسائی اور پانی کا چشمہ بھی ظاہر کر دیا۔

مِصر سے کیا مراد ہے؟

اِهْبِطُوْا مِصْرًا (۲/۶۱) مصر میں داخل ہو جاؤ۔

عام طور پر مصر کے معنی شہر ہی کے لیے گئے ہیں اور مصرًا کی تنوین سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ نکرہ کے لیے آئی ہے جس کا مطلب ہے "کسی شہر میں داخل ہو جاؤ"۔ لیکن ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک اس سے مشہور شہر مصر[۱] مراد ہے جس سے بنی اسرائیل نکلے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے دو دلائل بیان کیے ہیں۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر ہم مصر کو بغیر تنوین پڑھیں تو وہ معرفہ ہو گا اور دنیا میں مصر فرعون کے بغیر کوئی ایسا ملک نہیں جس کا نام مصر ہو۔ جب یہ لفظ علم اور صفت دونوں طرح پر آتا ہے تو زیادہ مناسب یہی ہے کہ اسے صفت کی بجائے علم پر محمول کیا جائے جس طرح ظالم اور حرث سے مذکورہ قیود کے ساتھ علم مراد لینا زیادہ صحیح ہے۔ اور اگر تنوین کے ساتھ پڑھا جائے تب بھی اسے علم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ تنوین تنکیر کے لیے نہیں بلکہ وسط کے لیے آتی ہے، جیسے نوح اور لوط پر تنوین آتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ اللہ نے جب بنی اسرائیل کو سرزمین مصر کا وارث قرار دیا تھا۔ اور جب وہ ان کے لیے موروثی حیثیت رکھتی تھی تو اس میں داخلہ ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے لیے سرزمین مصر کا موروثی ہونا اللہ کے اس قول سے ثابت ہے۔

وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور ہم نے بنی اسرائیل کو اس سرزمین کا وارث کر دیا۔

اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ سرزمین ان کے لیے موروثی تھی تو یہ لازم آتا ہے کہ ان کے

---

[۱] مصر ایک ملک کا نام ہے نہ کہ کسی شہر کا۔ مترجم

لیے اس کا داخلہ ممنوع نہ ہو۔ کیونکہ وراثت ملکیت کا فائدہ دیتی ہے اور ملکیت سے مطلق تصرف حاصل ہوتا ہے۔

اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ بعض حالات میں کوئی آدمی گھر کا مالک بھی ہوتا ہے مگر گھر میں اس کا داخلہ ممنوع بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ اعتکاف کے لیے مسجد میں بیٹھے تو اس کے گھر میں اس کا داخلہ ممنوع ہو جاتا ہے، حالانکہ وہ گھر اس وقت بھی اس کی ملکیت میں ہوتا ہے۔ جب یہ صورت جائز ہے تو اسے تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے۔ کہ اللہ نے ان کو مصر کا وارث قرار دے کر مصر اُن کی ملکیت میں بھی دے دیا۔ اور اُن کو اس میں تصرف کی اجازت بھی عطا کر دی لیکن اللہ نے پھر اس میں اُن کا داخلہ ممنوع بھی کر دیا۔

ذِلّت و مسکنت

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ۔ (۲/۶۱)	اور اُن پر مسلّط کر دی گئی ذلت اور مسکنت (محتاجی)۔

ذلّت کے معنی خواری و رسوائی ہیں :۔

الذلة والذل والصغار (ذلّت خواری و رسوائی کو کہتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

مسکنت کے معنی فقر و فاقہ اور محتاجی کے ہیں۔

المسكنة الفقر والفاقة والتشديد المحنة مسکنت فقر و فاقہ اور سخت محنت کو کہتے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

ابو مسلم کے نزدیک ذلت اور مسکنت کا عذاب اُس خاص قوم کے لیے تھا جسے بنی اسرائیل کہا جاتا تھا۔ اور جس نے اُن سنگین جرائم کا ارتکاب کیا تھا جن کا ذکر پچھلی آیات میں آچکا ہے۔ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ یہودی ہر زمانہ میں فقر و فاقہ کی مصیبت میں مبتلا رہیں گے۔

رفعِ طُور

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ (۲/۶۳)

اور جب ہم نے لیا عہد تمہارا اور اُٹھایا تم پر پہاڑ۔ (شاہ رفیع الدین)

ابن عباس کی تفسیر کے مطابق وَرَفَعْنَا کی واوٴ عاطفہ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے عہد لینا پہلے کا واقعہ ہے اور رفع طور بعد کا۔ یعنی پہلے عہد لیا گیا، پھر جب اُنھوں نے اِس عہد کو توڑ ڈالا اور اللہ کی اطاعت سے مُنہ موڑ لیا تو ان پر پہاڑ بلند کیا گیا۔ اس طرح کہ وہ سمجھتے تھے ابھی ہم پر گر جائے گا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ عہد لیتے وقت اُن کے اوپر پہاڑ بلند کیا تاکہ وہ اس کے گر جانے کے خوف سے تسلیم کرلیں۔ لیکن ابومسلم واوٴ کو حالیہ قرار دیتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے۔ فعلت ذالك والزمان زمان۔ تو آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ہم نے تم سے اس حال میں عہد و پیمان لیا جب کوہِ طور تم پر بلند تھا یعنی تم کوہِ طور کے دامن میں کھڑے تھے۔

پتھر اور خشیت

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ کَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ۔ (۲/۷۴)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس کے بعد بھی چنانچہ وہ مثل پتھر کے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت اور بیشک پتھر تو کوئی ایسا ہوتا ہے کہ اس سے دریا پھوٹ بہتے ہیں اور کوئی پھٹ جاتا ہے اور اُس میں سے پانی نکلتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے خشیت الٰہی کے باعث گر جاتا ہے

عام مفسرین کے نزدیک یہ تمام صفات پتھروں کی ہیں کہ اُن سے نہریں بہتی ہیں، چشمے پھوٹتے

ہیں اور کئی پتھر خشیت سے گر بھی جاتے ہیں۔ مگر ابو مسلم کا قول ان سب سے الگ ہے، اُن کے خیال میں وإنّ منها لما يهبط من خشية الله میں منہا کی ضمیر کا مرجع قلوب ہیں کیونکہ خشیت اُس خاص جذبہ کا نام ہے جو دل سے متعلق ہو۔ پتھروں کا خشیت سے کوئی تعلق نہیں۔ گویا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ان کے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہوگئے۔ بلا شبہ بعض پتھر ایسے ہیں کہ ان سے سوتے پھوٹ بہتے ہیں اور بعض دل ایسے ہیں کہ اُن پر خشیت طاری ہوتی ہے اور وہ فرمانِ خداوندی کے آگے جھک جاتے ہیں۔ مگر ایک اُن لوگوں کے دل ہیں کہ نہ اُنہیں دل کہا جا سکتا ہے نہ پتھر۔

اَمَانِیَّ کا مفہوم

وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ (۲/۷۸)	اور اُن میں سے کچھ اُمی ہیں جو کتاب میں سے کچھ نہیں جانتے سوائے اپنی خواہشات کے اور وہ محض گمان میں پڑے رہتے ہیں۔

تمنّٰی، امنیہ اور امانی تلاوت کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

تمنّی کتاب اللہ اوّل لیلۃ وآخرھا لاقی حمام المقادرٗ

(وہ رات کے ابتدائی حصہ میں کتاب اللہ پڑھتا رہا اور آخری حصہ میں جاں بحق ہوگیا۔)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیہ زیر نظر میں بھی "امانی" انہیں معنوں میں (تلاوت کے معنوں میں) آیا ہے۔ ابن عباس اور قتادہ کے نزدیک امانی سے مراد تلاوت ہے اور "امیون" سے وہ لوگ مراد ہیں جو کتاب کے معانی نہ سمجھیں محض الفاظ رٹ لیں۔ کسائی، زجاج اور ابن رسائب نے کہا کہ وہ نہ کتاب کو عمدگی سے پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ ان کا علم وہیں تک محدود ہے جہاں تک اُن کے علماء نے اُنہیں بتایا۔ ابو روق اور ابو عبیدہ کا خیال ہے کہ امانی سے مراد وہ تلاوت ہے جو ظہر قلب سے ادا کی جائے کتاب میں نہ پڑھی جائے۔ لیکن ابو مسلم کے نزدیک امانی کے معنی قلبی خواہشات لینا زیادہ صحیح ہے۔ کتاب اللہ میں ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصَارٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ۔

اور انہوں نے کہا کہ جنت میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا سوائے یہودیوں اور نصرانیوں کے یہ ہیں اُن کی اُمیدیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ

نہ تمہاری تمناؤں کے مطابق ہوگا نہ اہلِ کتاب کی تمناؤں کے مطابق جو بھی بُرائی کرے گا جزا پائے گا۔

ایک اور جگہ فرمایا۔

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

یہ ہیں اُن کی تمنائیں انہیں کہیے اگر وہ سچے ہیں تو دلیل لائیں۔

اِس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اہل کتاب میں سے بیشتر محض ان پڑھ ہیں۔ انہیں کتاب کا ذرا سا علم بھی حاصل نہیں ہاں اپنی خواہشات سے خوب واقف ہیں اور احکامِ الٰہی پر نہیں بلکہ اپنی نفسانی خواہشات پر عمل کرتے ہیں۔

اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ۔

کتاب کے علم میں وہ محض اٹکل پچو سے کام لیتے ہیں

یہود اور اسیروں کا فدیہ

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ

پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو اُن کے وطن سے نکال بھی دیتے ہو اور اُن کے مقابلہ میں گناہ اور ظلم کے ساتھ اُن کے مخالفین کی مدد بھی کرتے ہو اور اگر وہ اسیر ہو کر تم تک پہنچتے ہیں تو تم انہیں فدیہ

عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ (۸۵/۲)

دے کر چھڑا لیتے ہو حالانکہ اُن کا وطن سے نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہو۔

جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ اُس وقت مشرکین اوس اور خزرج دو متخاصم جتھوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یہودیوں کے قبائل بنی نضیر اور بنی قریظہ یہ کہا کرتے کہ جب مشرکین کے دونوں گروہوں میں لڑائی ٹھن جاتی تو یہودیوں کا ایک قبیلہ اوس کے ساتھ ہو جاتا دوسرا خزرج کے ساتھ رہتا۔ جنگ ہوتی اور ایک گروہ کی طرف سے جو یہودی قیدی ہو کر آتے اُنہیں وہی لوگ فدیہ دے کر چھڑا لیتے جنہوں نے میدانِ جنگ میں اُن کے خلاف تلواریں بلند کی تھیں۔ اور اُس قبیلہ کے بیشتر افراد کو قتل کیا تھا۔ ان لوگوں نے افتؤمنون ببعض الکتٰب ..... الخ کو پچھلی آیات سے مربوط قرار دیا ہے یعنی یہ قتل و اخراج توریت کی صریح خلاف ورزی تھی اور فدیہ لے کر انہیں چھڑا لینا توریت پر عمل تھا۔ ابو مسلم کے نزدیک تُفٰدُوْھُمْ کے معنی ہیں فدیہ لے کر رہا کرنا اُنھوں نے یہ مفہوم بیان کیا کہ قتل و غارت اور لوگوں کو اُن کے شہروں سے نکالنے کے علاوہ اگر کوئی قیدی تمہارے ہاتھ آتا ہے تو تم مال لیے بغیر نہیں چھوڑتے چاہے فدیہ لے کر قید سے نکالنا (اخراجھم) تمہارے لیے حرام ہی کیوں نہ ہو۔ اور افتؤمنون ببعض الکتٰب کا پچھلی آیات سے محض اتنا تعلق ہے کہ اس میں بھی ان کا ایک جرم بیان کیا گیا ہے۔ کہ حضور سرورِ کائنات کے متعلق تمہاری کتابوں میں جابجا پیش گوئیاں موجود ہیں لیکن تم ان پر ایمان نہیں لاتے اور اس کے بغیر اپنی کتاب کے باقی حصوں کو تسلیم کرتے ہو۔

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ کا صحیح مفہوم

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا

اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں نہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے اُن پر

تَمَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ (۲/۸۸) — لعنت کر رکھی ہے اور وہ بہت تھوڑا ایمان رکھتے ہیں

جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے مفسرین قلیل کو ایمان کی صفت قرار دیتے ہیں یعنی وہ بہت تھوڑے احکام پر ایمان رکھتے ہیں۔

ای لا یؤمنون لا بقلیل مما کلفوا به (کبیر۔ بیضاوی۔ مدارک۔ ابو سعود) — یعنی جن احکام پر انہیں مکلف کیا گیا ہے ان میں سے بہت کم پر ایمان لاتے ہیں۔

لیکن ابو مسلم کے نزدیک قلیل، مومنون کی صفت ہے یعنی ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لاتے ہیں۔

رسول اللہ صلعم کی آمد کا انتظار

وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ (۲/۸۹) — اور اس کے قبل وہ خود ہی (حضور کے متعلق) مشرکین کو بتایا کرتے تھے۔

وہ مشرکین کو آپ کی صفات بتاتے رہتے اور ان سے آپ کی پیدائش سے متعلق دریافت کرتے رہتے۔ یہاں یستفتحون، یفتحون کا مرادف ہے۔ اور فتح کے معنی خبر دینے اور بیان کرنے کے ہیں تو استفتاح خبر حاصل کرنے اور پوچھنے کے معانی میں آئے گا۔ یہ ابو مسلم اصفہانی کا قول ہے۔ جہاں تک دوسرے مفسرین کا تعلق ہے تو ان کا خیال ہے کہ یستفتحون اپنے عام اور مشہور معنی کے لحاظ سے طلب نصرت کا مفہوم رکھتا ہے ومعنی الاستفتاح الاستنصار (ابو حیان) یستنصرون بمحمد والقرآن (ابن عباس)

طویل زندگی کی لالچ

وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (۲/۹۶) — اور آپ انہیں سب لوگوں سے بڑھ کر زندگی پر حریص پائیں گے حتی کہ مشرکوں سے بھی بڑھ کر۔

ابومسلم کے نزدیک اِس آیت میں مضمون کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر ہے۔ اس کی ترتیب یوں ہوگی وَلَتَجِدَنَّهُمْ وَطَائِفَةً مِّنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ یعنی تو اُن کو اور مشرکین کے ایک گروہ کو طویل زندگی کے لیے بہت حریص پائے گا۔ ان میں سے ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ کاش وہ ہزار سال کی عمر پاتا۔

عام مفسرین کا خیال ترجمہ سے واضح ہے۔

ہاروت ماروت کا قصّہ

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۲:۱۰۲)

اور یہ لوگ اس علم کے پیچھے لگ گئے جو سلیمٰن کے عہد میں شیاطین پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا البتہ شیطان ہی کفر کرتے تھے۔ لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔ اور وہ اس علم کے پیچھے بھی لگ گئے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت ماروت پر اُتارا گیا تھا۔ اور وہ دونوں کسی کو بھی نہ بتاتے تھے جب تک یہ کہہ دیتے کہ ہم تو ایک امتحان ہیں سو تم کہیں کفر نہ اختیار کر لینا۔ مگر لوگ دونوں سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے وہ عورت مرد کے درمیان جدائی ڈال لیں۔ حالانکہ وہ فی الواقعہ کسی کو بھی اس کے ذریعہ نقصان نہیں پہنچا سکتے جب تک اللہ کا ارادہ نہ ہو اور یہ وہ چیز سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان پہنچا سکتی ہے نفع نہیں پہنچا سکتی۔ اور یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ جس نے اسے اختیار کیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور وہ بہت ہی بری چیز ہے

جس کے بدلے اُنھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے، کاش وہ اتنا ہی جانتے "

ان آیات میں ہاروت و ماروت جو دو نام آئے ہیں ان پر ہمارے بعض عجوبہ پرست مفسرین نے ایک عجیب و غریب قصّہ کی بنیاد رکھی ہے۔ چنانچہ تفسیر عزیزی نے ابن جریر، ابن ابی حاتم، حاکم اور دیگر تفاسیر نے ابنِ عباس رض، علی المرتضٰی ؑ مجاہد اور عبداللہ بن عمر رض سے روایت کی کہ حضرت ادریس علیہ السّلام کے زمانہ میں انسانوں کی بدکرداریاں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں۔ فرشتوں نے خدا کے سامنے انسان کی بداعمالیوں کی شکایت کی تو جواب ملا کہ انسان کو غصّہ اور شہوت دو ایسی چیزیں دی گئی ہیں کہ اگر تمہیں مل جائیں تو تم بھی گناہوں میں ڈوب جاؤ۔ فرشتوں کو اپنے تقوٰی پر ناز تھا، اُنھوں نے کہا ایسی چیزوں کے باوجود ہم گناہوں سے پاک رہیں گے۔ اللہ تعالٰی نے فرمایا تم اپنی جماعت میں سے دو نہایت متقی فرشتے چھانٹ لو انہیں ہم دونوں چیزیں دیدیتے ہیں۔ اور پھر دیکھ لیتے ہیں کہ وہ تقوٰی کی راہ سے بھٹکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ ہاروت اور ماروت دو تقوٰی شعار فرشتوں کا انتخاب ہوا۔ خدا نے انہیں غصہ اور شہوت دے کر بابل میں اُتار دیا تاکہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلے کریں۔ اور روزانہ شام کو اسمِ اعظم پڑھ آسمان پر آجایا کریں۔ یہ دونوں ایک مہینہ تک یوں ہی آتے جاتے رہے۔ زمین پر اُن کے عدل و انصاف کا چرچا ہونے لگا۔ اتفاق سے ایک حسینہ نے اپنے خاوند کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ عام روایات میں ہے کہ اس کا نام زہرہ تھا۔ مگر حضرت علی رض کی روایت میں ہے کہ اُس کا نام برخت اور لقب زہرہ تھا۔ خیر کچھ بھی ہو فرشتے تو دیکھتے ہی عاشق زار ہو گئے اور اُس سے بُرے کام کی خواہش کی۔ اس نے کہا میرے اور تمہارے دین میں بھی اختلاف ہے۔ دوسرے میرا شوہر بھی بڑا غیرت مند ہے اگر اُسے علم ہو گیا تو مجھے قتل کر دے گا۔ لہذا پہلے اُسی بُت کو سجدہ کرو جس کو میں اپنا معبود سمجھتی ہوں پھر میرے شوہر کو قتل کر دو پھر میں تمہاری اور تم میرے۔ اُنھوں نے انکار کیا وہ چلی گئی مگر اُن کے دل میں عشق کی آگ کچھ ایسی بھڑکی کہ زہرہ کے گھر پیغام بھیج دیا کہ ہم آرہے ہیں۔ اُس نے اجازت دے دی۔ دونوں جب وہاں پہنچے تو زہرہ خوب سج دھج کر بیٹھی تھی۔ آج اُس نے اپنے وصال کی

چار شرطیں پیش کیں۔

۱۔ یا تو وہ زہرہ کو اسم اعظم سکھا دیں۔

۲۔ یا وہ بُت کو سجدہ کریں۔

۳۔ یا وہ اُس کے شوہر کو قتل کر دیں۔

۴۔ یا وہ شراب پئیں۔

ہاروت ماروت نے اس آخری جرم کو ہلکا سمجھا اور شراب پی لی۔ جب مست ہو گئے تو زہرہ نے اُن سے بُت کو سجدہ بھی کرالیا۔ اپنا خاوند بھی قتل کرالیا اور اسم اعظم بھی سیکھ لیا۔ وہ تو اسم اعظم پڑھ کر اور صورت بدل کر آسمان پر پہنچ گئی۔ اللہ نے اُس کی روح کو زہرہ ستارے سے متصل کیا اور اُس کی شکل زہرہ ستارے کی طرح ہو گئی۔ فرشتے اسم اعظم بھول چکے تھے وہ اپنے گناہوں پر پشیمان ہوئے اور ادریس علیہ السلام کے پاس گئے۔ اور اپنی کہانی دردناک انداز میں بیان کی۔ ادریسؑ نے اُن کے حق میں دعائے مغفرت کی، دوسرے فرشتوں نے اپنی غلطی کا اقرار کیا اور انسانوں کے حق میں دعا کرنے لگے۔ آخر بہت روز کے بعد حضرت ادریس کی دعا کا جواب آیا کہ ہاروت ماروت کو اختیار ہے کہ اس دنیا کی سزا قبول کر لیں یا آخرت کی۔ انہوں نے دنیا کی سزا قبول کر لی۔ اور دونوں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر بابل کے کنوئیں میں اُلٹا لٹکا دیا گیا۔ اس کنوئیں میں آگ بھڑک رہی ہے اور یہ لٹکے ہوتے ہیں۔

یہ قصہ سنن بیہقی اور مسند امام احمد میں بھی ہے۔ بلکہ یہ روایات بھی آتی ہیں کہ بعض لوگوں نے انہیں اِس حال میں دیکھا بھی ہے اور اُن سے جادو سیکھا بھی ہے۔ چنانچہ حاکم نے اپنی مسند اور بیہقی نے اپنی سنن میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا حضورؐ کے انتقال کے بعد ایک عورت میرے پاس آئی جو انہیں پوچھتی تھی میں نے انتقال کے متعلق بتایا اور پوچھا کہ اُسے سرورِ کائنات سے کیا کام ہے۔ اُس نے بتایا کہ میں اپنے شوہر کی سختیوں سے تنگ آگئی تھی۔ میں نے ایک عورت سے اپنی اس مصیبت کا ذکر کیا۔ اُس نے مجھے ایک کتے پر سوار کرایا اور رات

کی آن میں بابل پہنچا دیا۔ کنوئیں میں ہاروت اور ماروت کو لٹکے ہوئے دیکھا اور اُن سے جادو سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پہلے اُنھوں نے سمجھایا کہ جادو کفر ہے مگر میں نے نہ مانا اور سیکھنے پر مصر رہی۔ آخر اُنھوں نے ایک تنور میں پیشاب کرنے کا مجھے حکم دیا میں نے ایسا کیا تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک نورانی سوار میرے جسم سے نکل کر آسمان کو اُڑ گیا ہے، میں نے اس کے متعلق اُن سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایمان تھا جو مجھ سے الگ ہوگیا۔ اب میں جادو میں ماہر ہوگئی۔ چنانچہ گندم کا دانہ زمین میں ڈال کر حکم کرتی ہوں تو فوراً اُگ آتا ہے پھر وہ بڑا ہو جاتا ہے اُسے خوشہ لگتا ہے آپ ہی آپ خوشے سے دانے نکل آتے ہیں، خود بخود پس جاتے ہیں اور پھر پکی ہوئی روٹی میرے سامنے آجاتی ہے۔ اتنی طاقت کے باوجود میں ایمان چھن جانے پر سخت شرمندہ ہوں اور چاہتی ہوں کہ ایمان مجھے واپس مل جائے۔

حضرت عائشہ رض کہتی ہیں کہ میں نے اُسے صحابہ رض سے ملنے کا مشورہ دیا کسی نے بھی آسے امید نہ دلائی۔ صرف ابن عباس رض نے کہا کہ اگر تیرے ماں باپ ہیں تو اُن کی خدمت کر۔

اِسی طرح کا ایک قصہ ابن منذر نے بھی اوزاعی سے نقل کیا ہے۔

اس قصہ کی لغویت پر کلام کرنے کی ضرورت نہیں علامہ بیضاوی نے صاف لکھ دیا ہے کہ

وما روی انهما مثلا بشرین و رکب فیهما الشهوة فحکی عن الیهود (بیضاوی ص۷)	یہ جو روایت ہے کہ ہاروت و ماروت فرشتے سے آدمی بنائے گئے اور اُن میں شہوت رکھی گئی تو یہ یہودیوں سے مروی ہے۔

صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں۔

وهذه القصة من اخبار الاحاد بل من الروایات الضعیفة الشاذة.. وان هذه الاخبار لم یرو منها شئ صحیح ولا سقیم عن النبی	یہ قصہ اخبار احاد بلکہ ضعیف و شاذ روایات سے منقول ہے اس قسم کی نہ کوئی صحیح حدیث نبی صلعم سے مروی ہے نہ غلط۔

صلی اللہ علیہ وسلم

آیت کے پہلے جزو واتبعوا ما تتلوا الشیٰطین علی ملک سلیمٰن کا ترجمہ
عام طور پر یوں کیا جاتا ہے "اور اس کے پیرو ہوئے جو کچھ کہ سلیمٰن علیہ السلام کے عہد سلطنت میں
شیطان پڑھا کرتے تھے"۔ لیکن ابو مسلم کو اس ترجمہ سے اختلاف ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ تتلوا
علی ملک سلیمٰن کے معنی ہیں کہ شیاطین عہد سلیمان کے متعلق جو جھوٹ بولتے تھے یہ لوگ
اُسی کے پیرو ہو گئے کیونکہ "تلیٰ علیہ" جھوٹ یا بہتان باندھنے کے معنوں میں آتا ہے۔ اور
"تلا عنہ" سچ کے لیے کہا جاتا ہے۔ اور اگر بالفرض دونوں جائز ہوں تب بھی بہتر یہ ہے
کہ یہاں بہتان یا افترار کے معنی لیے جائیں۔ کیونکہ تلاوت حقیقت میں خبر کے معنی دیتی ہے۔
"تلا فلان" اور "تلا علیٰ فلان" میں فرق یہی ہے کہ "تلا علیٰ فلان" صاف افترار کے معنوں
میں آتا ہے۔ صدق اور کذب میں امتیاز کے لیے علیٰ کا لفظ ہی کافی ہے۔ کیونکہ "روی علی فلان"
نہیں کہا جاتا، بلکہ "روی عن فلان" اور "اخبر عن فلان" کہا جاتا ہے۔ اور "تلا عن فلان"
تو یہ خبر اور تلاوت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ناجائز نہیں کہ وہ جو کچھ کہ تلاوت
کیا جاتا تھا اور پڑھا جاتا تھا پس اس میں کل اوصاف جمع ہیں۔

اور یہ خبر عطف ہے "علیٰ ملک سلیمٰن" پر اور اس کی تقدیر یوں ہے۔ "ما تتلوا
الشیٰطین افتراء علیٰ ملک سلیمٰن وعلیٰ ما انزل علی الملکین (یعنی شیاطین جو کچھ
پڑھتے تھے وہ سلیمان علیہ السلام کے متعلق اور اُس چیز کے متعلق افترا ہے جو دو فرشتوں پر نازل
کی گئی تھی۔)

ابو مسلم نے اس بات سے سختی کے ساتھ انکار کیا ہے کہ سحر فرشتوں پر اُتارا گیا تھا۔ اُن
کے دلائل یہ ہیں:۔

پہلی دلیل

خداوند قدوس کا ارشاد ولکن الشیٰطین کفروا یعلمون الناس السحر (بلکہ وہ شیاطین

تھے جنھوں نے کفر کیا اور لوگوں کو جادو سکھایا) اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ سحر کی تعلیم دینا کفر ہے اور اگر یہ چیز ملائکہ میں ثابت کی جائے تو لازم آئے گا کہ اُنھوں نے کفر کیا، اور یہ باطل ہے۔

دوسری دلیل

اگر سحر فرشتوں پر نازل کیا گیا تو یقیناً اسے منزل من اللہ ماننا پڑے گا، اور یہ بالکل ناجائز ہے، کیونکہ جادو کفر اور عبث ہے۔ اور ایسی چیز کا نزول خدائے قدوس کی ذاتِ مقدس کے شایانِ شان نہیں۔ وما قدروا اللہ حق قدرہ (اور ان لوگوں نے اللہ کی حقیقی قدر نہیں پہچانی۔)

تیسری دلیل

یہ جائز نہیں کہ انبیاء جادو سکھانے کے لیے مبعوث ہوں۔ تو یہ بات بطریقِ اولیٰ ناجائز ہے کہ ملائکہ اس کام پر مامور ہوں۔

چوتھی دلیل

جادو کی نسبت کفار، فساق اور مردود شیاطین کی طرف کی جاتی ہے پھر یہ کیسے جائز ہے کہ ہم اسی چیز کو اللہ کی طرف منسوب کریں جس سے وہ اپنے بزرگوں کو روکتا ہے اور نہ رکھنے والوں کو سخت سزا سے ڈراتا ہے۔ کیونکہ جادو جھوٹ کے سوا کچھ نہیں اور اللہ کا قانون اس کی بطالت واضح کرنے کے لیے ہمیشہ متحرک رہا ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا۔

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ إِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهُ۔ — اللہ اس جادو کو جلد ہی باطل کر دے گا جو تم لے کر آئے ہو۔

ان دلائل کے بعد ابو مسلم اس آیت کی تفسیر میں دوسرے تمام مفسرین کے خلاف ایک نئی راہ نکال لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جس طرح شیاطین نے سحر کی نسبت ملکِ سلیمان کی طرف کر دی حالانکہ سلیمان علیہ السلام کا اس سے قطعاً تعلق نہ تھا۔ اسی طرح اُنھوں نے جو چیز فرشتوں پر نازل ہوئی تھی اُسے

بھی سحر سے منسوب کیا، حالانکہ فرشتوں پر تو شریعت، دین اور دعوت الی الخیر کا نزول ہوا تھا۔ اور وہ یہی چیز لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اور اپنی بعثت کی غرض ظاہر کرنے کے لیے تاکیداً کہتے تھے کہ ہم تمہارے لیے آزمائش ہیں پس ہمارا انکار نہ کرو۔ اور ایک گروہ ایسا تھا جس نے اس پیغام کو قبول کیا اور دوسرے نے اس کی مخالفت کی۔ اور یہ گروہ ایمان اور کفران دو چیزوں میں سے ایسی چیزیں سیکھنا چاہتا تھا جن سے وہ مرد اور عورت کے درمیان تفرقہ ڈال سکیں۔ حالانکہ جادو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا، ہاں یہ الگ بات ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی کے نفع یا ضرر میں فیصلہ صادر ہو چکا ہو اور اتفاق سے جادوگر کا جادو بھی اس کے مطابق ہو جائے۔ یعنی اللہ کسی کو مارنے کا فیصلہ کر چکا ہو اور کوئی جادوگر بھی اُسے مارنے کے لیے جادو کر رہا ہو تو یہ اتفاقی امر ہے، کیونکہ اللہ کا فیصلہ بہر حال ہو کر رہے گا اور جادوگر کا نام ہو جائے گا۔

ناسخ منسوخ کی بحث

مَا نَنسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا (پ ۱)

ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو کوئی اُس سے بہتر یا مثل اُس کے لے آتے ہیں۔

اس آیت سے مفسرین یہ استدلال کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی بعض آیات دوسرے احکام سے منسوخ ہو گئی ہیں۔ علماء نسخ کی تین قسمیں قرار دیتے ہیں۔

نسخِ تلاوت۔ علماء کا خیال ہے کہ بعض آیات قرآنِ حکیم میں باقی نہیں رہیں حالانکہ وہ قرآن کی آیات تھیں اور پھر طرفہ یہ کہ اُن کا حکم باقی ہے اس کی دلیل میں کہا جاتا ہے کہ آیہ رجم پہلے قرآن میں موجود تھی پھر اُسے قرآن سے نکال دیا گیا اور نماز وغیرہ میں اُس کی تلاوت جائز نہیں تاہم اس کا حکم اب بھی باقی ہے۔ آیہ رجم یہ ہے :-

الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ

شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت اگر زنا کر بیٹھیں تو دونوں کو سنگسار کر دو یہ اللہ کی

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ طرف سے سزا ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے

تفسیر عزیزی میں اس قسم کی اور بھی بہت سی عبارتیں لکھی گئی ہیں جنہیں کتاب اللہ کی آیات قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ نسخ حکم۔ منسوخ فی الحکم وہ آیات قرار دی گئی ہیں جو مفسرین کے نزدیک قرآن میں موجود ہیں مگر ان کا حکم ساقط ہو گیا ہے۔ اس کی کئی مثالیں بیان کی جاتی ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

۳۔ نسخ تلاوت وحکم۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کی بعض آیات کا حکم بھی باقی نہیں اور وہ تلاوت سے بھی منسوخ ہو گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک آیت تھی عَشْرَ رَضَعَاتٍ مَّعْلُوْمَاتٍ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ عورت کا دودھ دس گھونٹ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی۔ مگر اب یہ آیت قرآن میں موجود ہے نہ اس کا حکم باقی ہے۔ اب ایک گھونٹ سے بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے —— قرآن میں نسخ کی دو صورتیں بیان کی جاتی ہیں :-

پہلی صورت۔ آیت کا نسخ آیت سے

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات بعض سے منسوخ ہیں جیسے مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ کی آیت اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا کی آیت سے۔

دوسری صورت۔ آیت کا نسخ حدیث سے

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی آیت اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ حدیث "لا وصیۃ للوارث" سے منسوخ ہے۔ اسی طرح اور آیات بھی احادیث سے منسوخ ہیں۔

جمہور مفسرین نسخ کے قائل ہیں۔ لیکن ابو مسلم اصفہانی ہی وہ پہلا مفسر ہے جس نے نسخ سے انکار کیا۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

جہاں تک پہلی قسم کا تعلق ہے تو ایک عام آدمی با ذنی تعمق سمجھ سکتا ہے کہ جس آیت کا حکم باقی رکھنا مقصود تھا، اس کی تلاوت کو منسوخ کرنا کسی صورت جائز نہیں۔ آخر اس میں کیا حکمت ہے

کہ حکم تو برقرار رہے لیکن کلام اللہ میں اس حکم کی عبارت موجود نہ ہو۔ اسی طرح تیسری قسم میں جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض آیات کا نہ حکم باقی ہے اور نہ ہی وہ قرآن میں موجود ہیں، یہ بھی کتاب اللہ کے شایانِ شان نہیں۔ جس کتاب کی حفاظت اللہ تعالٰے نے اپنے ذمے لے رکھی ہو اس میں کمی یا زیادتی کبھی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح نسخ کی صورتوں میں سے دوسری صورت کا بھی اکثر فقہاء نے انکار کیا ہے شافعی اس صورت کے خلاف خود حضور ہی کا قول پیش کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کلامی لا ینسخ کلام اللہ (میری بات اللہ کی بات کو منسوخ نہیں کر سکتی)۔

دوسرے فقہا یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن نصِ قطعی ہے اور حدیث نصِ ظنی پس یہ کسی صورت میں جائز نہیں کہ نصِ قطعی کو نصِ ظنی سے منسوخ مانا جائے۔ رہی یہ چیز کہ قرآن کی بعض آیات بعض سے منسوخ ہیں تو یہی وہ چیز ہے جسے تمام مفسرین تسلیم کرتے ہیں۔ مگر غور کیجیے تو یہ بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ کہنا کہ قرآن کے بعض احکام بعض کے مخالف ہیں۔ اللہ کے اس دعوے کی تردید کرتا ہے کہ قرآن میں کوئی اختلاف نہیں۔ اللہ تعالٰی نے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل بھی یہی دی ہے کہ اس کی آیات میں باہم تناقض و اختلاف نہیں لو کان من عند غیر اللّٰہ لوجدوا فیہِ اختلافاً کثیرًا۔ اب جو لوگ بعض آیات کو دوسری آیت سے منسوخ مانتے ہیں انہیں یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ایسی آیات باہم مختلف ہیں کیونکہ اگر اختلاف نہ ہو تو منسوخ قرار دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم نسخ کے مسئلہ کو غلط ٹھہراتا ہے بلکہ کوئی ضعیف سے ضعیف حدیث بھی ایسی نہیں جس میں خود حضور نے فرمایا کہ قرآن کی بعض آیات بعض سے منسوخ ہیں یا کسی ایک آیت کے متعلق ہی کہہ دیا ہو کہ یہ منسوخ ہے۔ صحابہ کے اقوال میں بعض آیات کے متعلق بے شک نسخ کا لفظ آیا ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ جس آیت کو ایک صحابی منسوخ مانتے ہیں دوسرے اسی کو غیر منسوخ قرار دیتے ہیں۔ تو ہم اس صحابی کے قول کو کیوں نہ تسلیم کریں جس سے قرآن میں اختلاف نہیں ماننا پڑتا۔ صحابہ کے اقوال میں لفظ نسخ کا استعمال وسیع معنوں میں ہوا ہے یعنی جب کبھی کسی آیت سے کسی صحابی کو غلط فہمی پیدا ہوئی اور دوسری آیت نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا تو

ایسے موقع پر بھی وہ نسخ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مفسرین میں بھی اختلاف ہے بعض کسی ایک آیت کو منسوخ بھی تسلیم کرتے ہیں اور پھر اسی کی غیر منسوخی کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں اور اگر نسخ کے تمام اقوال کو تسلیم کر لیا جائے تو قرآن کا بہت بڑا حصّہ (نعوذ باللہ) محض بے کار ہو جاتا ہے امام سیوطی کا بیان ہے کہ پانچ سو آیات کو منسوخ کہا گیا ہے اور ان میں سے خود امام سیوطی نے اکیس آیتیں منسوخ مانی ہیں۔ لیکن ابو مسلم اصفہانی نے اُن اکیس کی بھی تفسیر کی اور ثابت کر دیا کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔

۱۔ کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین (جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وہ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض ہے کہ وصیت کرو والدین اور اقربا کے لیے۔) (۲/۱۸۰)

اس آیت کو منسوخ کہا جاتا ہے۔ مگر اس کے ناسخ میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت وراثت سے منسوخ ہے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت حدیث "لا وصیۃ للوارث" سے منسوخ ہے۔ حدیث سے تو صرف وہی لوگ استدلال کرتے ہیں جن کے نزدیک نص قطعی نص ظنی سے منسوخ ہو سکتی ہے۔ اس کے اجماع میں کلام ہے۔ رہا اس آیت کا آیہ وراثت سے منسوخ ہونا تو ابو مسلم کہتے ہیں کہ دونوں آیتوں میں کوئی تناقض نہیں۔ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

(**اوّلاً**) اس آیت میں وصیت سے وہ عام معانی مراد نہیں جو مفسرین سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہاں وصیت الٰہی سے اللہ کا حکم مراد ہے جس طرح دوسری جگہ ہے۔ یوصیکم اللہ فی اولادکم (اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں وصیت کرتا ہے) پس زیر نظر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم میں سے کوئی قریب الموت ہو تو اُس پر فرض ہے کہ اپنے والدین اور اقربا کے لیے اُن احکام پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کرے جو اللہ تعالیٰ نے آیۂ وراثت میں ذکر کیے ہیں۔ تاکہ اُس کا مال خدا کے قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہو اور کسی کے حصہ میں کمی نہ کی جائے۔

(ثانیاً) اگر یہ تاویل کی جائے تب بھی دونوں قسم کی آیتوں میں کوئی اتنا تناقض نہیں رہتا کہ میراث تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ورثا کے لیے عطیہ ہے اور وصیت خود مرنے والے کا عطیہ ہے۔ پس وارث کے لیے دو چیزیں جمع ہوگئیں ایک قریب الموت آدمی کی وصیت اور دوسرے اللہ کا عطیہ۔

(ثالثاً) وراثت والی آیت میں بھی تو وصیت کو تسلیم کیا گیا ہے پھر وصیت والی آیت کو ہم منسوخ کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ آیۂ وراثت میں ورثاء کے حصص متعین کرنے کے بعد کتاب اللہ میں تصریح ہے کہ یہ حصے اُس مال سے دیے جائیں گے جو وصیت یا قرض ادا کرنے کے بعد باقی رہے گا من بعد وصیۃ یوصی بہا او دین (۴-۱۲) آیت زیرِ نظر کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اگر قریب الموت آدمی اپنے والدین اور اقربا کے لیے مال کثیر چھوڑ رہا ہو تو اسی پر فرض ہے کہ خیراتی کاموں کے لیے بھی وصیت کرے۔ سعد بن ابی وقاص کی متفق علیہ حدیث بھی اس مطلب کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ جب وہ بیمار ہوئے تو اُن کی صرف ایک بیٹی تھی، وہ وصیت کرنا چاہتے تھے کہ سارا مال خیراتی کاموں پر صرف کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا اور صرف ایک تہائی مال کی وصیت کی اجازت دی تاکہ ورثا بالکل محروم نہ رہیں۔ پس ظاہر ہے کہ آپؐ نے بھی یہاں وصیت سے خیراتی کاموں کے لیے وصیت مراد لی تھی۔ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہ سے بھی ایسے ہی فیصلے مروی ہیں۔

(رابعاً) دونوں آیتوں میں تطبیق کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ یہ وصیت اُن والدین اور اقرباء کے لیے تسلیم کر لی جائے جو وراثت سے محروم ہوں۔ مثلاً ایک آدمی کے والدین کافر ہیں تو وراثت میں اُنہیں کوئی حصّہ نہیں مل سکتا تو لازمی ہے کہ اُن کے لیے وصیت کی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی اور احسان کا حکم دیا ہے۔ و بالوالدین احسانا و ذی القربےٰ

ابن جریر اور بیضاوی نے اس آیت کے غیر منسوخ ہونے پر اقوال نقل کیے ہیں۔ ان سے بھی ابو مسلم کی تائید ہوتی ہے۔

(۲) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ط فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ط وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ط فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ط وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو لکھا گیا ہے اوپر تمہارے روزہ جیسا کہ لکھا گیا تھا اوپر اُن لوگوں کے جو پہلے تم سے تھے۔ تاکہ تم پرہیزگاری کرو۔ روزہ دن گنتی کے پس جو کوئی ہو تم میں سے بیمار یا اوپر سفر کے پس گنتی ہے اور دنوں سے اور اوپر اُن لوگوں کے کہ طاقت رکھتے ہیں اس کی اور روزہ نہیں رکھتے بدلا ہے کھانا ایک فقیر کا پس جو کوئی کرے زیادہ نیکی پس وہ بہتر ہے واسطے اس کے اور یہ کہ روزہ رکھو تم بہتر ہے واسطے تمہارے اگر ہو تم جانتے۔ (۲/۱۸۴) (ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب)

جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ط کا یہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر روزہ نہ رکھیں تو وہ فدیہ دیدیں۔ روایات میں ہے کہ پہلے پہل لوگوں کو اجازت تھی کہ جو بھی روزہ نہ رکھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت متصل لعد والی آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ ...... الخ سے منسوخ ہے۔ کیونکہ اس آیت میں بھی اس آیت کی باقی تمام ہدایات دُہرائی گئی ہیں۔ لیکن وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ط کا فقرہ ذکر نہیں کیا گیا پس پہلے یہ اجازت تھی کہ "روزہ نہ رکھو تو فدیہ دے دو" لیکن اب وہ رعایت ختم ہو گئی۔ ابو مسلم اس آیت کو بھی منسوخ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک دونوں قسم کی آیات میں کوئی تناقض نہیں۔

ابو مسلم کہتے ہیں یہ عجیب بات ہوئی کہ "جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں وہ فدیہ دے دیں"، تو گویا جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے وہی روزہ رکھیں۔ اصل میں اس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ "تم میں سے جو بیمار ہوں یا سفر پر ہوں پس وہ روزے قضا کریں۔

پھر صحت کے وقت یا سفر ختم ہونے کے وقت، روزے بھی رکھیں اور اُن میں سے جو مسکین کو طعام کھلانے کی طاقت رکھتے ہوں وہ فدیہ بھی دے دیں۔ یعنی دولتمندوں پر روزوں کی قضا کے ساتھ فدیہ بھی لازم کیا گیا۔ اس طرح سوچیے تو یہ آیت محکم اور غیر منسوخ ہے۔

اضافہ

اِس آیت کے محکم ہونے پر ایک یہ دلیل بھی ہے کہ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ کے معنی لیے جائیں "وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکتے ہوں"۔ کیونکہ "طاقت" طوق سے ماخوذ ہے اور یہ اُس قدرت کو کہتے ہیں جسے انسان مشقت، و دشواری سے کر سکے۔ اس کی تائید ائمہ تفسیر و لغت کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔ پطرس بستانی لکھتے ہیں۔

"طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی اُس مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے (لا تحملنا مالا طاقة لنا کے بھی یہ معنی نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جس کا بجا لانا ہمارے لیے بہت دشوار ہو"۔

(محیط المحیط جلد دوم ص۱۳۰۴)

علامہ ابن منظور کہتے ہیں:۔

"طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لیے بمشقت کرنا ممکن ہو"۔ (لسان العرب جلد ۱۲ ص۱۰۳)

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:۔

"طاقت قدرت کی اُس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لیے بدشواری ممکن ہو"۔ (المفردات فی غریب القرآن ۔ ط)

"الطاقة اُس قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بدشواری کیا جا سکے۔ یعنی وہ کام انسان پر اتنا شاق گزرے جیسے کسی نے اُس کی گردن میں طوق

ڈال دیا ہو" (تاج العروس - اقرب الموارد)

علامہ زمخشری فرماتے ہیں :-

"طاقۃ - کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جاسکے اور وَعلی الذین یطیقونہ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن پر روزہ شاق ہو پس اُن کے لیے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے - چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں"۔ (تفسیر کشاف - جلد اول ص ۲۵۵)

علامہ شبستری لکھتے ہیں :-

"عربی زبان میں الوسع اُس قدرت کے لیے استعمال ہوتا ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طاقۃ کا لفظ اُس قدرت کے لیے آتا ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو - لہذا آیۂ وعلی الذین یطیقونہ کے معنی یہ ہوں گے کہ " اور اُن لوگوں پر جو تکلیف اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے"۔ (روح المعانی الجزء الثانی ص ۵۹)

مفتی محمد عبدہ فرماتے ہیں :-

"الطاقۃ دراصل مکنت و قدرت کے بالکل ادنیٰ درجے کا نام ہے - چنانچہ عرب اطاق الشئ صرف اُس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ضعیف ہو جائے یعنی بدشواری اسے برداشت کیا جاسکے چنانچہ یطیقونہ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں ہوسکتی -" (تفسیر المنار - ج ۲ ص ۱۵۵)

گویا اللہ تعالیٰ نے ایک اصول بیان فرما دیا کہ روزہ جن لوگوں پر سخت شاق گذرتا ہو وہ فدیہ دے دیں - اس اصول کی جزئیات مرتب کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے علامہ قرطبی لکھتے ہیں :-

"تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے سے معذور ہوں یا شدید مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکیں ان کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے۔ امام ربیع رح اور امام مالک رح کہتے ہیں کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں، ہاں امام مالک رح نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں تو میرے نزدیک پسندیدہ فعل ہے حضرت انس رض ابن عباس رض، ابو ہریرہ رض، اور قیس بن السائب نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمے فدیہ ہے۔ امام شافعی رح مع اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمد رح اور امام اسحاق رح کا قول بھی یہی ہے کہ انہیں فدیہ دینا چاہیے۔ نیز ابن عباس رض کی روایت ہے کہ انہوں نے اپنی ام ولد سے فرمایا جو حاملہ تھیں یا بچے کو دودھ پلا رہی تھیں کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بمشقت روزہ رکھ سکتے ہیں لہذا تیرے ذمے فدیہ ہے قضا نہیں۔"

(جامع احکام القرآن ج ۲ ص ۲۶۸ و ۲۶۹)

مفتی محمد عبدہ رح نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے فرماتے ہیں۔

"اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" سے یہاں بوڑھے اور اپاہج لوگ مراد ہیں جن کی معذوری دور ہونے کی توقع نہیں۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جن کی معاش خدا نے پرمشقت کاموں میں رکھ دی ہو۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لیے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہے..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے روزہ رکھنا گراں ہو جس کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو۔ جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ افراد جو بیمار بھی نہیں مگر روزہ انتہائی دشواری سے رکھ سکیں۔ جیسے حاملہ اور دودھ پلانے والی، ان سب کے لیے جائز ہے کہ وہ روزہ کی بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا

دیں اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے "۔

(تفسیر المنار۔ ج ۲۔ ص ۱۵۵۔ ۱۵۷)

علامہ قرطبی ؒ نے ابنِ عباس رضؓ کی جو روایت نقل کی ہے وہ واضح طور پر اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں اور "وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ" کا یہ مفہوم ہے کہ جو لوگ سخت دشواری سے روزہ رکھ سکتے ہیں وہ فدیہ دیدیں۔

اس آیت کا اگلا حصّہ بھی اس مفہوم کی تائید کرتا ہے ارشاد ہے فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ (جو شخص برضا و رغبت قابل برداشت مشقت سے نیک کام کرے تو وہ اُس کے لیے بہتر ہے۔) اس میں يُطِيقُونَهُ اور تَطَوَّعَ کا فرق بالکل اُسی مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ تَطَوَّعَ سے مراد ایسی اطاعت جو برضا و رغبت معمولی سی تکلیف سے کی جا سکے۔ ایک اور جگہ کرہًا کے مقابلہ میں طوعًا لایا گیا ہے۔

قائلین نسخ کی یہ دلیل کوئی وقیع دلیل نہیں کہ " دوسری آیت میں باقی تمام چیزیں دہرائی گئی ہیں۔ لیکن وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين نہیں دُہرایا گیا اس لیے اِسے منسوخ سمجھنا چاہیے "۔ کیونکہ یہ تو قرآن کا عام انداز ہے، کہیں جگہ قرآن اللہ، ملائکہ، انبیاء، کتب اور یوم آخرت پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اور کہیں صرف اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کا ذکر ہوتا ہے۔ اب جس طرح یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ، ملائکہ، کتب، انبیاء اور یوم آخرت پر ایمان والی آیت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان والی آیت سے منسوخ ہے، اسی طرح زیر نظر آیت کا بھی اگر تکرار و اعادہ نہیں ہوا تو اسے منسوخ نہیں کہا جا سکتا۔ (مترجم)

(۳) أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ (تمہارے لیے روزے کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رغبت کرنا حلال کیا گیا ہے، وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے لباس ہو۔ اللہ

جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کو نقصان پہنچاتے تھے پس اُس نے تمہاری طرف رجوع برحمت کیا اور تم کو معاف کیا۔ پس اب بیویوں سے میل جول کرو" ($\frac{۲}{۱۸۷}$)

نسخ کے قائل اس آیت کو بھی اپنی دلیل سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے رمضان کی راتوں میں خاوند بیوی کا ملاپ حرام کیا تھا۔ پھر اس آیت میں پہلے حکم کو منسوخ کیا گیا تھا اور مباشرت کو حلال ٹھہرایا گیا۔ روایات میں ہے کہ رمضان میں مسلمان رات کے وقت اپنی بیویوں کے پاس نہ جاتے تھے۔ اور حکم بھی یہی تھا۔ چند آدمی چوری چھپے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے تھے پس اللہ نے یہ آیت اُتاری جس میں پچھلے حکم کو منسوخ کر دیا گیا اور جن لوگوں نے خلاف ورزی کی تھی انہیں معاف کر دیا گیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ حکم کہاں ہے جس کی ناسخ یہ آیت ہے، اس کا قائلین نسخ کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ابومسلم کہتے ہیں کہ رمضان کی راتوں میں عورتوں کے پاس جانے کی ممانعت اسلام میں نہیں بلکہ نصرانیت میں تھی۔ یہ آیت عیسوی شریعت کے حکم کو منسوخ کرتی ہے ہماری شریعت کا کوئی حکم منسوخ نہیں۔ مفسرین اس قول کی تردید میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ آیت كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح اُن لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے) میں چونکہ ہمارے روزوں کو اُن کے روزوں سے تشبیہہ دی گئی ہے اور یہ حرمت چونکہ نصاریٰ کے روزوں میں ثابت تھی، اس لیے تشبیہہ کا یہ فائدہ ہوا کہ گویا یہ ہماری شریعت کا ہی حکم تھا۔ اور یہ آیت اُس حکم کو منسوخ کرتی ہے۔ اس لیے لازماً ہماری شریعت کا حکم منسوخ ہوا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر ہماری شریعت میں یہ چیز پہلے سے ہی حلال تھی تو پھر اُحِلَّ لَكُمْ (تمہارے لیے حلال کیا گیا) کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (اللہ جانتا تھا کہ تم اپنی جانوں میں خیانت کرتے تھے) کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ

اگر یہ چیز پہلے سے ہی اُن کے لیے حلال ہوتی تو پھر اُنہیں خیانت کی کیا ضرورت تھی۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ چیز اُن کے لیے حرام نہ ہوتی اور وہ اس سلسلہ میں معصیت کا اقدام نہ کر چکے ہوتے تو فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ (پس اللہ نے تم پر رجوع برحمت کیا اور تمہیں معاف کیا) کے الفاظ محض بے معنی ہیں۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ اگر یہ چیز پہلے بھی حلال ہوتی تو فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوهُنَّ (پس اب اُن سے میل جول کرو) کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

چھٹی دلیل یہ ہے کہ اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ حرمت ہماری شرع میں ثابت تھی۔

یہ ان لوگوں کے دلائل ہیں جو قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ ابو مسلم نے ان دلائل کی بھی تردید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ روایات کے ساتھ ہم اس حد تک متفق ہیں کہ فرضیت صوم کے بعد مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ نصاریٰ کی طرح ہم پر بھی رات کو عورت کے پاس جانا ممنوع ہے لیکن یہ اُن کا اپنا خیال تھا اللہ کا حکم نہیں تھا۔ اب ان دلائل پر غور کیجیے جو اس سلسلہ میں پیش کیے گئے ہیں۔

پہلی دلیل بالکل ضعیف ہے کیونکہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ میں صوم کو صوم سے تشبیہ دینا مقصود ہے۔ یہ مقصد نہیں کہ صوم کی پوری شرائط اور جزئیات بھی دونوں مذاہب میں ایک جیسی ہوں گی۔

دوسری دلیل بھی کمزور ہے کیونکہ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ حرمت ہم سے پہلے کی شریعتوں میں ثابت ہے پس أُحِلَّ لَكُمْ کے یہ معنی ہوئے کہ وہ چیز جو دوسروں کے لیے حرام تھی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کر دی۔

تیسری دلیل کا بھی یہی حال ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ خیال ضرور تھا

کہ نصاریٰ کی طرح رات کو عورتوں کے پاس جانا ہمارے لیے بھی ممنوع ہے۔ اور وہ اسی لیے ان کے پاس نہ جاتے تھے۔ پس اللہ نے یہ حکم نازل کر کے ان کا شبہ دور کر دیا اور انہیں واضح طور پر بتا دیا کہ یہ حکم مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ تخون کے بنیادی معنی کسی چیز کو کم کرنے کے ہیں خَوَّنَہٗ اُس کو کم کر دیا۔ فی ظھرہٖ خون اس کی کمر کمزور ہے۔ نگاہ کی چند ھیاہٹ کے لیے بھی خون کا لفظ استعمال ہوتا ہے "خیانت" نقص اور بے وفائی کے معنوں میں آتا ہے۔ خَانَ، اِخْتَانَ اور تَخَوَّنَ، کَسَبَ، اِکْتَسَبَ اور تَکَسَّبَ کی طرح ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ خان الدلو الرِشَاءِ کے معنی ہیں رسّی نے ڈول سے بیوفائی کی اور درمیان سے ٹوٹ گئی۔ خانہ الدھرُ کے معنی ہیں زمانہ نے اُس سے بے وفائی کی یعنی اُس کی حالت میں نقص پیدا کر دیا۔ اس کی حالت بگاڑ دی پس عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے جان لیا کہ تم نے اپنی جانوں سے بے وفائی کی اور ایک جائز چیز کو اپنے لیے ممنوع قرار دے کر اپنے نفس کے حقوق میں کمی کی۔ اب یہ واضح احکام اس لیے دیے جا رہے ہیں کہ اپنے نفس کے حقوق کی ادائیگی میں بے وفائی نہ کرو انہیں پوری طرح ادا کرو۔

چوتھی دلیل کی حیثیت بھی تارِ عنکبوت سے زیادہ نہیں فَتَابَ عَلَیْکُمْ کا صرف یہی مفہوم نہیں کہ کوئی توبہ کرے اور اللہ اُس کی توبہ قبول کرے۔ توبہ اگر بندوں کی طرف سے ہو تو اس کا مطلب ہے ایک قسم کی عبادت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرنا اور اللہ رحمت اور احسان کے ذریعہ بندوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ عَفَا عَنْکُمْ میں عفو در اصل وسعت اور کشادگی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے تو فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان و انعام کیا اور وسعت و کشادگی عطا فرمائی کہ جو احکام پہلی شریعتوں میں سخت تھے وہ تمہارے لیے نرم کر دیے۔ "عفو" کا لفظ وسعت، کشادگی اور زیادتی کے معنوں میں عام استعمال ہوتا ہے۔ عفو المال اُس مال کو کہتے ہیں جو ضرورت سے زاید ہو

کتاب اللہ میں ہے یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ (اے نبی لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں فرمادیجیے کہ جو کچھ ضرورت سے زاید ہو)۔ اَعْطَيْتُهٗ عَفْوَ الْمَالِ کے معنی ہیں ہیں نے اُسے بغیر مانگے مال دیا۔ العفو من الماء اُس پانی کو کہتے ہیں جو پینے والوں سے بچ جائے اور تکلیف و مزاحمت کے بغیر حاصل ہو سکے۔ عفا شعر البعیر کے معنی ہیں اونٹ کے بال لمبے اور زیادہ ہو گئے۔ عفا علیہ فی العلم کے معنی ہیں وہ علم میں اس سے آگے بڑھ گیا۔ اور اس نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ عَفْوٌ بہترین چیز کو بھی کہتے ہیں اور اُس چیز کو بھی جس کے حصول میں دقت پیش نہ آئے۔

پانچویں دلیل کا بھی یہی حال ہے۔ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ وہ لوگ مباشرت سے رُکے ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے احکام واضح فرمادیے اور شبہ کو زائل کر دیا تو ارشاد ہوا فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ (پس اب اپنی بیویوں سے میل جول کرو)۔

رہی چھٹی دلیل تو وہ اور بھی کمزور ہے۔ ہمارا قول ہے کہ یہ آیت پہلی شریعتوں کے حکم کو منسوخ کرتی ہے۔ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ صحابہ نے کس طرح عمل کیا۔ دوسرے خبرِ واحد اس معاملہ میں حجت نہیں ہو سکتی۔ پھر آیۂ زیرِ نظر کے الفاظ بھی تو ایسی روایات کے ضعف پر دلالت کرتے ہیں۔ روایات کہتی ہیں کہ ان لوگوں نے رسولِ خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا لیکن قرآن کہتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی جانوں کی خیانت کی، یہ نہیں کہا گیا کہ اُنھوں نے اللہ کی خیانت کی، پس اگر وہ کوئی گناہ کرتے تو اللہ کی خیانت ہوتی۔

یہ تفسیر نقل کر کے علامہ رازی لکھتے ہیں "فَتَابَ عَلَيْكُمْ" کے معنی ابو مسلم کے نزدیک یہ ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں اجازت کے ساتھ رجوع کیا اور تم کو وسعت دی"۔ جو مفسرین نسخ کے قائل ہیں اُن کے نزدیک ضروری ہے کہ "تُبْتُمْ" کا لفظ مقدر مانا جائے یعنی آیت کی ترتیب یوں ہے کہ "تُبْتُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ"، پس یہ جائز نہیں کہ ہم کوئی خاص معانی پیدا کرنے کے لیے اپنی طرف سے الفاظ زائد کرتے رہیں۔ ابو مسلم نے "عَفَا عَنْكُمْ"

کے معنی کیے ہیں: "اللہ نے تم کو وسعت دی"۔ عفو کا لفظ واقعی وسعت اور کمی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ رسولِ خدا صلعم کا ارشاد ہے عفوت لکم عن صدقۃ الخیل و الرقیق (میں نے تمہارے گھوڑوں اور غلاموں کے صدقہ میں کمی کر دی) ۔ دوسری جگہ آپ نے فرمایا "اولی الوقت رضوان اللہ واٰخرہ عفو اللہ"۔ یہاں بھی یہی تخفیف مراد ہے۔ "اتانی ھذا المال عفواً" کا مطلب ہے یہ مال مجھے آسانی سے ہاتھ آ گیا"۔ پس ثابت ہوا کہ عفو کا لفظ بھی اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا کہ پہلے رمضان کی راتوں میں مباشرت حرام تھی۔ نیز اگر قائلین نسخ کا قول تسلیم کیا جائے تو "عَفَا عَنْكُمْ" میں بھی زیادتی کرنا پڑے گی، اور اس کی ترتیب "عَفَا عَنْ ذُنُوْبِكُمْ" ہوگی۔ اس کے برعکس ابومسلم کی تفسیر کو تسلیم کیا جائے تو کسی قسم کی مخفی ضمیروں کو نہیں ماننا پڑتا۔ نیز "تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ" کے الفاظ بھی ابومسلم کی تفسیر کی صحت پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ اس خیانت کو اللہ نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اُن کی جانوں کی خیانت کہا ہے اگر یہ گناہ ہوتا تو اللہ کی خیانت ہوتی۔

۴۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ۔ (۲/۲۱۷) اس آیت کو "قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً" والی آیت سے منسوخ تسلیم کیا گیا ہے۔ ابومسلم کہتے ہیں کہ دونوں آیات میں موضوع کا اس قدر بعد ہے کہ ان میں نسخ تسلیم کرنا عجیب مضحکہ خیز سی بات ہے۔ یہ حکم "قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ" زمانہ سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حکم افراد سے متعلق ہے۔ دونوں احکام میں کسی قسم کا تناقض نہیں، دونوں کے موضوع الگ الگ ہیں، پہلی آیت میں ہے کہ "اے نبی یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ حرمت والے مہینے میں جنگ کرنا کیسا ہے، کہہ دیجیے کہ اس میں جنگ کرنا بہت برا ہے"۔ اور دوسری آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین سے جنگ کرو، یہ تو نہیں کہا گیا کہ اس مہینہ میں جنگ کرو۔ یہ تو ایک مطلق حکم ہے۔ نیز پہلی آیت میں بھی صرف یہی کہا گیا ہے کہ حرمت والے مہینہ میں جنگ کرنا برا ہے وہاں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ اگر مشرکین کی دراز دستیاں حد سے بڑھ جائیں تب بھی تم آرام سے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو بلکہ اس کے برعکس متصل بعد والی آیت میں تصریح کی گئی ہے کہ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ (اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے باشندوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک حرمت والے مہینہ میں جنگ کرنے سے بھی زیادہ بُرا ہے اور فتنہ قتل سے بڑھ کر بُرا ہے)۔ یعنی بے شک حُرمت کے مہینے میں جنگ کرنا بُری بات ہے لیکن فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانا ، اللہ کی راہ سے روکنا اور مکہ کے باشندوں کو ہجرت پر مجبور کرنا تو اس سے کہیں بڑھ کر بُری باتیں ہیں ۔ اندازِ بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حُرمت والے مہینہ سے متعلق کفار نے استفسار کیا تھا اس کا جواب دے کر اللہ نے فرمایا کہ تم کون ہو ایسی باتیں پوچھنے والے تم تو ایسے بدترین جرائم کا ارتکاب کرچکے ہو جو قتل وغارت سے بڑھ کر ہولناک ہیں ۔ چونکہ فتنہ کو قتل سے زیادہ ہولناک جُرم کہا گیا ہے اس لیے حکم ہوا کہ قاتلوا حتیٰ لاتکون فتنۃ اور قاتلوا المشرکین کافۃ ۔ پس درحقیقت ان آیات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ ٹھہرایا جائے ۔

۵ ۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ (تم میں سے جو مر جائیں اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں (اور) اپنی عورتوں کے لیے یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک گھر سے نکالے بغیر انہیں خرچ دیا جائے پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں جو انہوں نے بھلائی سے اپنے حق میں کیا ہے ۔) (۲/۴۰)

اس آیت کی ناسخ وہ آیت بیان کی جاتی ہے جس میں بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن بتائی گئی ہے وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ

أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۚ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ

(اور تم میں سے جو مر جائیں اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں وہ اپنے آپ کو چار ماہ اور دس دن انتظار میں رکھیں پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے حق میں پسندیدہ طریق پر کریں) (۲/۲۳۴)

مفسرین کہتے ہیں کہ اول الذکر آیہ (۲/۲۴۰) میں قریب الموت آدمی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے حق میں وصیت کر جائے کہ وہ ایک سال تک بیٹھی انتظار کرتی رہے اور اُسے نان ونفقہ ملتا رہے۔ موخرالذکر آیت میں عدت کی مدت کو گھٹا کر چار ماہ دس دن کر دیا گیا ہے۔ پس اول الذکر آیت منسوخ ہوئی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اول الذکر آیہ (۲/۲۴۰) آیتِ عدت (۲/۲۳۴) سے منسوخ نہیں کیونکہ اول الذکر آیت میں ایک سال کی قید محکم نہیں بلکہ اشارۃً اس کا ذکر آیا ہے کیونکہ بیوہ اُس کو اس مدت کے اندر بھی دوسرا نکاح کرنے کی اجازت ہے فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ ۗ۔ ان لوگوں کے نزدیک آیہ (۲/۲۴۰) آیۂ وصیت (۴/۱۲) سے منسوخ ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آیۂ (۲/۲۴۰) میں خاوند پر فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ایک سال کے نان ونفقہ کے لیے وصیت کر جائے۔ اس کے بعد اُس کے ترکہ میں بیوہ کا کوئی حصّہ نہیں لیکن آیتِ وراثت میں بیوہ کا باقاعدہ حصّہ مقرر کیا گیا ہے اس لیے یہی آیت اس کی ناسخ ہے۔

ابومسلم اصفہانی کہتے ہیں "بیوہ کے ساتھ اسلام سے پہلے کسی قانون نے انصاف نہیں کیا زمانۂ جاہلیت کے مشرکین میں ظلم کا یہ انوکھا طریقہ رائج تھا کہ مرنے والے اپنی بیویوں کے لیے ایک سال کے نان ونفقہ اور رہائش کی وصیت کر جاتے تھے۔ اب عورت پہ لازم ہو جاتا کہ وہ ایک سال کی عدت پوری کرے۔ اس عرصہ کے دوران میں عورت کے لیے اور مرنے والے کے

ورثار کے لیے عورت کا کسی اور سے نکاح کرنا گناہِ کبیرہ خیال کیا جاتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی قریب الموت اگر وصیت کر بھی جائے کہ اُس کی عورت ایک سال تک گھر رہے اور اُسے نان و نفقہ دیا جائے تب بھی عورت کے لیے یا ورثار کے لیے یہ کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ آپ کی وصیت کو توڑ کر معروف طریقہ سے نیا نکاح کر لے۔ پس جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وصیت کرنے کا حکم دیا ہے انہیں آیت کے الفاظ پر غور کرنا چاہیئے "اَزْوَاجًا" اور "وَصِيَّةً" دونوں "يَذَرُوْنَ" کے مفعول ہیں پس اس کے یہی معنے ہوئے کہ تم میں سے جو مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں اور ان کے لیے وصیت کر جائیں کہ انہیں ایک سال تک گھر میں رکھا جائے اور نان و نفقہ دیا جائے تو وہ عورتیں اگر معروف طریقہ سے نکاح کر لیں تو تمہارے لیے کوئی گناہ نہیں"۔ اب چاہے آیت عدّت (۲/۲۳۴) کو لیجے چاہے آیت وراثت (۴/۱۲) کو دونوں آیات کا متذکرۃ الصدر آیت سے کوئی تعارض نہیں۔ قرآن وصیت کا حکم نہیں دیتا بلکہ اُس وصیت کو بے معنی ٹھہراتا ہے"۔

ابو مسلم کی تفسیر نقل کر کے علامہ رازی اس کی معقولیت کی مندرجہ ذیل وجوہ بیان کرتے ہیں:

(۱) قرآن میں نسخ تسلیم کرنا اصل کے خلاف ہے پس بقدر امکان ایسی صورت اختیار کرنی چاہیے کہ آیات کا باہمی تعارض رفع ہو۔ تعارض ثابت کرنے کی کوشش جائز نہیں۔

(۲) اصولِ فقہ میں یہ امر ثابت ہے کہ اگر تعارض اور تخصیص دونوں کا احتمال ہو تو تخصیص اعلیٰ ہے۔ بخاری نے مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت (۲/۲۴۰) منسوخ نہیں مخصوص ہے یعنی یہ وصیت ایسی عورت کے لیے ہے جو حاملہ ہو پس وہ وضع حمل تک انتظار کرے گی پس نسخ تسلیم کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ مجاہد کا قول اختیار کر لیا جائے۔

تاہم ابو مسلم کا قول بہت ہی پاکیزہ ہے کیونکہ اگر وصیت کو حکمِ خداوندی تسلیم کیا جائے تو یہ ضرور ہے کہ آیت میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ زائد کیے جائیں۔ اس صورت میں عبارت یوں ہو گی۔ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا فَلْيُوْصُوْا وَصِيَّةً (جو لوگ بیویاں چھوڑ جائیں پس وہ

وصیت کریں) لیکن ابو مسلم کی بیان کردہ تفسیر میں ہمیں اپنی طرف سے کسی قسم کے اضافہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب کلام اللہ میں مفہوم میں وضاحت کے لیے پوری عبارت صحیح ترتیب کے ساتھ آگئی ہے اور اُس سے آیات کا باہمی تعارض بھی لازم نہیں آتا تو پھر ہم خواہ مخواہ دو آیات کا تعارض ثابت کرنے کے لیے کیوں اپنی باتیں کتاب اللہ کے منہ میں ڈال کر اپنی خواہش کے مطابق مطالب حاصل کریں۔ جمہور مفسرین نے جس طرح ضمائر تسلیم کیے ہیں ان سے نسخ لازم آتا ہے لیکن ابو مسلم کی تفسیر کو ہر عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ایسی باتوں سے احتراز کریں جن میں بعض آیات کو بعض کا مخالف ٹھہرایا گیا ہے۔

۶۔ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۔

(اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اُسے چھپاؤ اللہ اُس کا تم سے حساب لے گا۔) (۲/۲۸۴)

اس آیت کو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ کسی نفس کو اُس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا) سے منسوخ مانا جاتا ہے۔ ابو مسلم کہتے ہیں کہ دونوں قسم کی آیات میں کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی ایسا نہیں جس کی بنا پر ان میں باہمی تناقض یا اختلاف تسلیم کیا جائے۔ لوگ کام کچھ کرتے ہیں اور اُن کے دلوں میں چھپی ہوئی خواہشات کچھ اور ہوتی ہیں۔ منافق مسلمانوں کے ساتھ نظامِ حق و صداقت کی کامیابی کی دعائیں مانگتے۔ مگر اُن کا دل اس نظام کے خلاف نفرت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایک شخص محض دکھاوے کی خاطر ادائے صلوٰۃ کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے، حالانکہ اُس کا دل کافر ہوتا ہے اور اُس میں خدا کا ادنیٰ سا تصور بھی موجود نہیں ہوتا۔ پس ایسی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور وہ اُن کا حساب لے گا۔ دوسری آیت کا مفہوم بالکل الگ ہے، اُس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے قدوس کسی آدمی کو اُس کی طاقت سے زیادہ فرائض کا مکلف نہیں کرتا۔

قائلین نسخ کہتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں وساوس شیطانی پیدا ہوتے رہتے ہیں اگر

اللہ ان تمام کا حساب لے تو یہ یقیناً طاقت سے زیادہ تکلیف دینا ہے۔ کیونکہ وسوسۂ شیطانی دل میں نہ گزرنے دینا انسان کے بس سے باہر ہے ابو مسلم کہتے ہیں کہ آیت کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ یہاں وساوسِ شیطانی مراد نہیں بلکہ وہ عزائم مراد ہیں جو منافقوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اگر ان میں وساوس ہی مراد لیے جائیں تب بھی اسی آیت کا اگلا ٹکڑا اس کی وضاحت کرتا ہے کہ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ط یعنی اس حساب کے بعد اللہ کے قانونِ مشیت کے مطابق جو قابلِ بخشش ہوا اس کی مغفرت ہو جائے گی اور جو سزا کا مستحق ٹھہرا اُسے سزا ملے گی اللہ تعالیٰ عادل ہے وہ یہ نہیں کرے گا کہ کسی ایسی بات پر انسان کو عذاب میں مبتلا کرے جو اس کے بس سے باہر ہو۔ پس دونوں آیات میں کسی طرح بھی نسخ کا احتمال نہیں۔

۷ ۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ (۳/۱۰۲)

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے)

اِس آیت کو فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کا تقویٰ اختیار کرو یعنی جہاں تک ہو سکے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو) سے منسوخ سمجھا جاتا ہے۔ نسخ کے قائل کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں تقویٰ کا حق ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں امکان بھر تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ تقویٰ کا حق ادا کر دینا بہت مشکل کام ہے اور اس کے مقابلہ میں امکان بھر تقویٰ اختیار کرنا سہل بات ہے۔ پس پہلی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہوئی۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ مَا اسْتَطَعْتُمْ سے تقویٰ کی انتہائی بلندی مراد ہے یعنی جہاں تک ہو سکے تقویٰ اختیار کیا جائے اور یہی تقویٰ کا حق ادا کرنا ہے۔ مثلاً ایک شخص ایک ہزار روپے کا مقروض ہے وہ اپنے دوست سے اعانت کی درخواست کرتا ہے۔ دوستی کا حق ادا کرنا تو یہ ہے کہ وہ اس کا تمام قرض ادا کر دے مگر دوست کی کل کائنات ایک سو روپے کی رقم ہے وہ یہ ساری رقم دوست کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا ہے، تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اُس نے دوستی کا حق ادا نہیں

کیا؟ نہیں! اُس نے دوستی کا حق ادا کر دیا، کیونکہ اپنی ساری کائنات دوست کے قدموں پہ نچھاور کر دی۔ فرض کیجیے اسلامی لشکر کی اعانت کے لیے امیر المومنین مسلمانوں سے مال طلب کرتے ہیں۔ ایک شخص ایک لاکھ روپیہ دیتا ہے اور غریب جس کی کل کائنات پانچ روپے کی حقیر رقم ہے وہ وہی لا کر رکھ دیتا ہے تو یقیناً دونوں نے تقویٰ کا حق ادا کر دیا۔ پس دونوں آیات ایک دوسرے کی توضیح کرتی ہیں اور ان میں نسخ کا قطعاً احتمال نہیں۔

۸۔ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ (۴/۸)

(اور جب تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو اُن کو ان میں سے کچھ دیدو اور اُن سے اچھی بات کہو۔)

اس آیت کو منسوخ کہا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ آخر اس کو منسوخ کرنے والی آیت کونسی ہے۔ اس لیے بعض مفسرین نے اسے محکم کہا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اس آیت کا حکم باقی ہے: یہ الگ بات ہے کہ لوگ اس پہ عمل پیرا ہونے میں سستی کرتے ہیں۔ رشتہ داروں سے وہی لوگ مراد ہیں جو وراثت سے محروم ہوں۔

۹۔ وَالّٰتِىْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِى الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا٥ وَ الَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا۔ (۴/۱۵-۱۶)

(اور تمہاری عورتوں میں سے جو "الفاحشۃ" کا ارتکاب کریں تو اپنے میں سے چار گواہ ان پہ لاؤ پس اگر وہ گواہی دیدیں تو اُن کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انہیں موت لے جائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راہ نکال دے اور اگر دو مرد اس کا ارتکاب کریں تو ان کو سزا دو پھر اگر توبہ کریں اور اصلاح کر لیں تو اُن کو جانے دو۔)

اس آیت کو سورۂ نور کی اُس آیت سے منسوخ سمجھا جاتا ہے جس میں زنا کی سزا کا ذکر ہے مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں "الفاحشہ" سے مراد زنا ہے۔ اس کی سزا یہ مقرر کی گئی ہے کہ ایسی عورتوں کو گھر میں بند کر دینا چاہیے حتےٰ کہ یا وہ مر جائیں اور یا پھر اللہ ان کی سزا کے متعلق فیصلہ کر دے ــــ بعد میں وہ فیصلہ سورۂ نور میں ہو گیا۔ اس لیے یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

ابو مسلم کے نزدیک "الفاحشہ" سے "سحاقت" مراد ہے یعنی عورتوں کی عورتوں کے ساتھ بدفعلی، اور اس کی سزا یہ ہے کہ انہیں گھروں میں بند رکھا جائے تاکہ وہ دوسری عورتوں سے نہ ملیں، یا تو اس حالت میں اُن پر موت آجائے گی اور یا پھر اللہ اُن کے لیے کوئی راہ نکال دے"۔ یعنی وہ توبہ کر لیں۔ جس طرح پہلی آیت وَالّٰتِیۡ عورتوں کی بدفعلی کے لیے مخصوص ہے اسی طرح وَالَّذٰنِ مردوں کی باہمی بدفعلی یعنی لواطت سے مخصوص ہے کیونکہ "وَالَّذٰنِ" مذکر تثنیہ کا صیغہ ہے۔ یہاں یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ "وَالَّذٰنِ" سے مرد اور عورت دونوں کا مراد ہونا جائز ہے۔ اور مذکر کا صیغہ تغلیب کے قاعدہ کے مطابق لایا گیا ہے۔ پھر جب دونوں کا احتمال ہے تو "وَالَّذٰنِ" کو صرف دو مردوں سے کیوں مخصوص کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بالفرض ایسی صورت ہوتی تو پھر عورتوں کا الگ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پس جب عورتوں، اور مردوں کا علیحدہ ذکر کیا تو معترضین کا استدلال بے معنی ثابت ہوا۔

اگر مفسرین کے قول کو صحیح تسلیم کیا جائے اور یہاں "الفاحشہ" سے زنا مراد لیا جائے تو عورتوں اور مردوں کا الگ ذکر کرنا بے سود تھا۔ اس کے برخلاف ہم نے جو معانی نقل کیے ہیں ان کی تصدیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جب مرد مرد کے ساتھ بدفعلی کرے تو وہ زانی ہیں اور عورت عورت کے ساتھ بدفعلی کرے تو وہ بھی زنا کرنے والیاں ہیں یعنی دونوں کو سزا ملے گی۔

اَوۡ یَجۡعَلُ لَھُنَّ سَبِیۡلًا کا مطلب مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

بعد میں اُن کے لیے یہی راہ نکالی جس کا ذکر سورۂ نور میں ہے۔ اِس کے برخلاف ہم یہ مطلب لیتے ہیں کہ وہ توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ نکاح کی سبیل پیدا کر کے اُن کی شہوت کو جائز راہ پر ڈال دیگا۔ پس اگر زنا کی سزا کے لیے یَجْعَلُ لَهُنَّ سَبِيلًا کے الفاظ آئے ہوتے تو لَهُنَّ کی بجائے عَلَيْهِنَّ ہوتا۔ کیونکہ "ل" ضرر کے لیے نہیں آتا۔

پس یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ اپنے حکم میں محکم ہے۔

۱۰۔ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ (۴/۳۳)

(جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں انہیں ان کا حصہ دو۔)

اَلَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ اصطلاح میں انہیں مولی الموالاۃ کہا جاتا ہے عرب میں دستور تھا کہ دو شخص باہم قول و قرار کر کے ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہو جاتے یہ ترکہ میں سے حصہ پاتے تھے مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں بھی "مولی الموالات" کا حصہ رکھا گیا ہے۔ لیکن اس حکم کو سورۂ احزاب کی اس آیت سے منسوخ کر دیا گیا وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ (اور رشتہ دار اللہ کے حکم میں مومنوں اور مہاجروں کی نسبت ایک دوسرے پر زیادہ حق رکھتے ہیں) لیکن نسخ کسی طرح ظاہر نہیں کیونکہ مولی اب بھی وراثت پا سکتا ہے اور فقہائے عراق نے اسی سے دلیل پکڑی ہے اور اس کا رتبہ رشتہ داروں سے بعد کا ہے۔ پس یہ دونوں آیات ایک دوسرے کی وضاحت کرتی ہیں، جس کا کوئی رشتہ دار ہو تو وہ دوسری آیت کی رو سے اُس کا وارث ہے اور جس کا کوئی رشتہ دار نہ ہو اُس کا مولا اُس کا وارث ہے۔

۱۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ (۵/۲)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینے کی)

اس میں وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ کا ٹکڑا منسوخ تسلیم کیا جاتا ہے قائلینِ نسخ کی دلیل وہی ہے کہ قتال بعد میں مباح ہو گیا آیہ (۲/۲۱۷) کے تحت اس پر بحث ہو چکی ہے۔

۱۲ - فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ (۵/۴۲)

(پس اگر وہ تیرے پاس آئیں تو اُن کے درمیان فیصلہ کر یا اُن سے مُنہ پھیر لے)

یہود و نصاریٰ کے متعلق ہے کہ اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو یا اُن کا انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجیے اور یا اُن کا فیصلہ کرنے سے اعراض کر لیجیے۔ مفسرین اس آیت کو بھی منسوخ قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کی ناسخ وہ آیت ہے جس میں یہود و نصاریٰ کے درمیان فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ آپ چاہیں تو فیصلہ کرنے سے انکار کر دیں فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (سو اُن کے درمیان اُس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے تیری طرف نازل کیا اور اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کر)

ان دونوں آیات کو بھی کسی طرح منسوخ نہیں کہا جاسکتا۔ دوسری آیت کو غور سے دیکھا جائے تو وہ پہلی آیت کی تکمیل کرتی ہے۔ گویا حکم یوں ہے کہ "جب وہ لوگ آپ کے پاس آئیں تو یا ان کا فیصلہ کیجیے یا فیصلہ کرنے سے انکار کر دیجیے پس فیصلہ کرنا ہو تو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کیجیے"۔ اس مفہوم پر خود پہلی آیت کا آخری حصہ بھی دلالت کرتا ہے جہاں فرمایا وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (اگر آپ فیصلہ کریں تو انصاف سے فیصلہ کریں)۔

پس دونوں آیات میں نسخ کا احتمال نہیں۔ دوسری آیت (جسے ناسخ قرار دیا جاتا ہے) کو پہلی آیت کے اسی آخری ٹکڑے کا قائم مقام سمجھنا چاہیے۔

۱۳ - يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ (۵/۱۰۶)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی تم میں سے جب کسی کو موت آجائے تو وصیت کے لیے اپنوں میں سے دو صاحب عدل لوگوں کی گواہی ہے یا کوئی اور دو تمہارے غیر میں سے اگر

تم زمین میں سفر کر رہے ہو پھر تم کو موت کی مصیبت پہنچے)۔

قائلین نسخ کہتے ہیں کہ یہاں مرنے والا جو وصیت کرے اس کی گواہی کے سلسلہ میں دو مسلمان صاحب عدل گواہوں کی گواہی بھی قبول کی گئی ہے اور دو غیر مسلموں کی گواہی بھی قابل قبول قرار دی گئی ہے۔ پس یہ حکم آیہ وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ سے منسوخ ہے کیونکہ وہاں صرف مسلمانوں کی گواہی قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

لیکن نسخ کا احتمال یہاں بھی باطل ہے۔ کیونکہ دو غیر مسلم گواہوں کی گواہی اس وقت قبول کی گئی ہے جب وصیت کرنے والا سفر میں ہو۔ ایسی صورت میں اگر اس کے ساتھی مسلمان نہ ہوں تو وسعت کی خاطر خدا نے غیر مسلم گواہوں کی گواہی کو بھی جائز قرار دیا ہے تاکہ مرنے والے کی آخری خواہش پوری ہو کر رہے۔ دوسری آیت میں عام قاعدہ بیان کیا گیا ہے اور پہلی آیت خاص حالات کے ساتھ مشروط ہے۔ اس لیے دونوں میں نسخ کسی صورت جائز نہیں۔

۱۴۔ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۸/۶۵)

(اگر تم میں سے بیس ڈٹ جانے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں گے۔ اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آئیں گے۔)

مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت اگلی آیت سے منسوخ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم اگر ایک سو ہوئے تو دو سو پر غالب آؤ گے اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا اور وہ جانتا ہے کہ تم میں کمزوری ہے سو اگر تم میں سے ایک سو ڈٹ جانے والے ہیں تو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب ہوں گے۔)

دونوں آیات میں نسخ کا احتمال نہیں کیونکہ دوسری آیت میں وضاحت کردی گئی ہے کہ اب مسلمانوں میں ضعف آچکا ہے اِس لیے سو آدمی دوسو کے مقابلہ میں کافی ہیں۔ دونوں آیات اگرچہ خبر کے طور پر آئی ہیں لیکن ان سے حکم مراد ہے کیونکہ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ کے الفاظ حکم کی دلالت کرتے ہیں پس پہلی آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم بیس ہی ثابت قدم رہنے والے ہو تو دوسو کے مقابلہ کے لیے تیار ہو جاؤ اور اگر تم سو ہو تو ایک ہزار کفار کے مقابلہ پر آمادہ ہو جاؤ۔ دوسری آیت میں چونکہ یہ علت واضح کی گئی کہ مسلمانوں میں ضعف آگیا اِس لیے وہاں سو آدمیوں کو دوسو کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ پس دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں بلکہ مختلف وقتوں کے احکام ہیں کہ اگر قوت پہلے کی طرح ہو تو بیس دوسو کا مقابلہ کریں اور اگر مسلمانوں کی قوت کم ہو تو سو دوسو کا مقابلہ کریں، گویا پہلی آیت میں مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے سے دس گنا فوج کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اور دوسری آیت میں رخصت دی گئی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ ضعف کی حالت میں بھی کم از کم دوسو کا مقابلہ تو کرنا چاہیے۔ پہلی آیت عزیمت پر دلالت کرتی ہے اور دوسری رخصت پر۔ پس کوئی نہیں کہہ سکتا کہ رخصت نے عزیمت کو منسوخ کر دیا۔ اور پھر اس وقت تو نسخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب آیات قوت اور ضعف کے حالات کے ساتھ مشروط ہیں۔ اور دوسری آیت ضعف کے لیے مخصوص ہے جس طرح پانی نہ ہونے کی مجبوریوں میں اللہ نے تیمم کی رخصت دی اسی طرح قوت نہ ہونے کی حالت میں بھی اللہ نے رخصت دی ہے۔ پس جس طرح یہ نہیں کہا جا سکتا آیت تیمم نے آیت وضو کو منسوخ کر دیا ہے اسی طرح یہاں بھی نسخ کا سوال نہیں اُٹھایا جا سکتا۔

۱۵ - اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ - (۹/۴۱)

(ہلکے اور بوجھل نکل پڑو اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔)

اِس آیت کو آیاتِ عذر سے منسوخ سمجھا جاتا ہے "لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ" "وَلَيْسَ

عَلَى الضُّعَفَاءِ وَعَلَى الْمَرْضٰى"۔ ان دو آیات کے علاوہ بعض مفسرین اس آیت کو بھی ناسخ شمار کرتے ہیں "وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً"، حالانکہ یہ آخری آیت تعلیم سے نفرت کے موضوع پر ہے۔ مذکورہ آیات ناسخ نہیں بلکہ وہ پہلی آیت کی توضیح کرتی ہیں اور اس کا مفہوم واضح طور پر متعین کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ محتاجوں کو بھی بھاگنے کا حکم دے پس یہ اللہ کے اس دعویٰ کی تصدیق ہے "قرآن کی تشریح ہمارے ذمہ ہے"، "إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" اور ان آیات میں نسخ کا احتمال نہیں۔

۱۶۔ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ (۲۴/۳)

(زانی نہیں "نکاح" کرتا مگر زنا کرنے والی عورت یا مشرک عورت سے اور زنا کرنے والی عورت کے ساتھ کوئی نکاح نہیں کرتا سوائے زانی اور مشرک کے)۔

اس آیت کو وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى (اور نکاح کرو رانڈوں کو اپنے میں سے) منسوخ قرار دیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں ان دونوں آیتوں میں کونسا اختلاف تھا کہ مفسرین نے یہاں بھی ناسخ منسوخ کا سوال اُٹھا دیا۔ ابو مسلم پہلی آیت کے ایسے معانی بیان کرتے ہیں جن سے آیہ (۲۴/۳۲) نہ منسوخ کہی جاسکتی ہے اور نہ کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"نَكَحَ" کے معنی ملانے اور جمع کرنے کے ہیں۔ "نَكَحَ النعاس" کے معنی ہیں "نیند آنکھوں میں گھل گئی"، "نَكَحَ المطر الارض"، کے معنی ہیں "بارش زمین میں جذب ہوگئی"۔ یہی لفظ نکاح استعارہ کے طور پر وطی اور جماع کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ "زانی صرف زانیہ یا مشرکہ کے ساتھ ناجائز تعلق پیدا کرتا ہے اور زانیہ کے ساتھ کوئی بھی ناجائز تعلق پیدا نہیں کرتا سوائے زانی یا مشرک کے"۔ اس کے بعد اللہ نے ارشاد فرمایا وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ٥ (اور یہ چیز یعنی ناجائز تعلق یا زنا مسلمانوں پر حرام کیا گیا ہے۔) ایک عورت اگر زانیہ رہی ہو تو مسلمانوں کے لیے اس کے ساتھ نکاح کرنا حرام نہیں زنا حرام ہے۔ پس اس

آیت میں نکاح سے عقد شرعی مراد نہیں ۔ ابن عباس سے بھی یہی معنی مروی ہیں جو ابو مسلم نے بیان کیے ہیں ۔ ان معانی کو صحیح تسلیم کیا جائے تو نسخ کا احتمال بھی ختم ہو جاتا ہے اور آیت پر بھی کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں ہوتا ۔

۱۷ - یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْکُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَکُمْ مِّنَ الظَّھِیْرَۃِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوۃِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّکُمْ ؕ لَیْسَ عَلَیْکُمْ وَلَا عَلَیْھِمْ جُنَاحٌ بَعْدَھُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَیْکُمْ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَعْضٍ ؕ ۔ ($\frac{۲۴}{۵۸}$)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی جن کے تمہارے دائیں ہاتھ مالک ہوئے اور وہ جو تم میں سے بلوغ کو نہیں پہنچے چاہیے کہ تین مرتبہ تم سے اندر آنے کی اجازت لے لیا کریں ۔ نمازِ فجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو کپڑے تبدیل کر لیتے ہو اور نمازِ عشا کے بعد تین وقت تمہارے پردے کے ہیں ۔ ان کے بعد نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ اُن پر کوئی گناہ ہے ، تم ایک دوسرے کے پاس پھرتے ہی رہتے ہو ۔)

اس آیت کو بھی منسوخ کہا جاتا ہے لیکن اس کا ناسخ بیان نہیں کیا جاتا ۔ اصل میں اس آیت کے نسخ پر کوئی دلیل نہیں بلکہ یہ تو بلند اخلاق ہیں جو اللہ نے انسانوں کو سکھائے تاکہ بتائے ہوئے اوقات میں ان کے غلام اور نابالغ لڑکے بغیر اجازت داخل نہ ہوں معلوم نہیں اس سے نسخ کا پہلو کہاں سے پیدا ہو گیا ۔

۱۸ - یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الّٰتِیْٓ اٰتَیْتَ اُجُوْرَھُنَّ ۔ ($\frac{۳۳}{۵۰}$)

(اے نبی ! ہم نے تیرے لیے تیری وہ بیویاں جائز کر دیں جنہیں تو نے اُن کے مہر دیے) اور لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِھِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ (اس کے بعد تیرے لیے اور عورتیں نکاح میں لانا جائز نہیں اور نہ یہ کہ تو ان کی جگہ دوسری بیویاں بدلے)

مفسرین ان دونوں آیتوں میں بھی نسخ کے قائل ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ "پہلی آیت میں نبیؐ کو پوری اجازت دی گئی ہے کہ جن عورتوں کو بھی وہ مہر دیں وہ اُن کے نکاح میں آسکتی ہیں، اور دوسری آیت میں مزید نکاح سے بھی منع کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپؐ ایک بیوی کو طلاق دے کر اُس کی جگہ کسی اور بیوی سے نکاح بھی نہیں کر سکتے۔ دونوں قسم کے احکام ایک دوسرے کے خلاف ہیں، اس لیے ان میں نسخ ہے۔"

لیکن ان میں بھی نسخ تسلیم کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ پہلی آیت میں یہ کہا گیا کہ جو بیویاں آپ کے گھر موجود ہیں وہ آپ پر حلال ہیں اور دوسری آیت میں آئندہ نکاح کرنے سے ممانعت کر دی گئی۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب تعدد ازواج کی اجازت دیتے وقت چار کی حد مقرر کر دی گئی، تو دوسرے مسلمانوں نے جن کے ہاں چار سے زائد بیویاں تھیں چار بیویاں قیدِ نکاح میں رہنے دیں اور زائد کو طلاق دے دی۔ یہ مطلقہ عورتیں دوسرے مردوں کے ساتھ شادی کر سکتی تھیں۔ اس لیے کوئی دشواری پیدا نہ ہوئی۔ لیکن رسولِ خداؐ کے معاملہ میں یہ مشکل تھی کہ اگر آپ چار بیویوں کو رہنے دیتے اور باقی کو طلاق دے دیتے تو ان مطلقہ ازواجِ مطہرات کے ساتھ کوئی اَور مسلمان شادی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کتاب اللہ نے انہیں امہات المومنین (مسلمانوں کی مائیں) قرار دے دیا تھا۔ اس لیے نبی کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ چار سے زائد ازواجِ مطہرات کے ساتھ کیا کیا جائے۔ اللہ تعالٰے نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ "اے نبی ہم نے تیری لیے وہ بیویاں جائز کر دی ہیں جنہیں تو نے اُن کے مہر ادا کیے۔" یعنی پہلے سے جو بیویاں موجود ہیں وہ حلال ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اللہ نے آئندہ نکاح کرنے سے منع فرما دیا۔ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ۔ آیت کے آخری ٹکڑے پر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالٰی نے نبی اکرمؐ پر ایک ایسی پابندی عائد کی ہے جو دوسرے مسلمانوں پر نہیں۔ دوسرے مسلمان بیویاں تبدیل کر سکتے ہیں یعنی اگر ایک شخص کے پاس چار بیویاں ہیں تو وہ یہ کر سکتا ہے کہ ان میں سے ایک کو جائز

طریقہ سے طلاق دے دے اور اس کی بجائے کسی اَور عورت سے نکاح کر لے لیکن نبی کے لیے واضح حکم ہے وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ اس حکم میں اُس علت کی طرف صریح اشارہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ اس میں در اصل ازواجِ مطہرات کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے کیونکہ اگر انہیں طلاق دی جاتی تو وہ کسی اَور مسلمان سے نکاح نہیں کر سکتی تھیں۔

اِس تفسیر سے واضح ہوگیا کہ دونوں آیات میں کوئی اختلاف نہیں۔

۱۹ ۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۵۸/۱۲)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمان جب تم رسول سے علیحدہ بات چیت کرو تو اپنے مشورہ سے پہلے صدقہ دے لیا کرو۔ یہ تمہارے لیئے بہتر ہے اور زیادہ پاکیزگی کا موجب ہے۔ پھر اگر تم نہ پاؤ تو اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔)

اِس کو متصل بعد والی آیت سے منسوخ سمجھا جاتا ہے۔ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ (کیا تم ڈر گئے؟ کہ اپنے مشورہ سے پہلے صدقہ دیا کرو۔ تو جب تم نے ایسا نہ کیا اور اللہ نے تم پر رجوع برحمت کیا ہے تو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو)۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ صدقہ کا حکم وجوبِ زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہوا۔ پھر کوئی کہتا ہے پہلی آیت کا حکم دس روز قائم رہا تھا، کوئی کہتا ہے صرف ایک گھڑی، کوئی کہتا ہے کہ عمل سے پہلے اُسے منسوخ کر دیا گیا، لیکن اگر غور کیجیے دونوں آیتوں میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ پہلی آیت میں بھی صدقہ دینے کے حکم کے ساتھ اللہ نے فرمایا اگر صدقہ نہ دے سکو تو اللہ غفور و رحیم ہے دوسری آیت میں بھی یہی کہا گیا کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ تعالیٰ اس پر گرفت نہیں کرتا۔ چنانچہ

"فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا" کے بعد ہے "وَ تَابَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ" پس دونوں کا ماحصل ایک ہے جو دینا چاہے اُسے دینا افضل ہے اور جو نہ دے تو اللہ اُس پر کوئی گرفت نہیں کرتا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دوسری آیت پہلی آیت کی تشریح کرتی ہے اُسے منسوخ نہیں کرتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو اسے فرضیتِ زکوٰۃ کے ساتھ منسوخ تسلیم کرتے ہیں تو ان کا قول اور بھی زیادہ ضعیف ہے۔ کیونکہ مشورہ کے صدقہ کا زکوٰۃ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

۲۰۔ وَاِنْ فَاتَکُمْ شَیْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ اِلَی الْکُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا (۶/۱۱)

(اور اگر تمہاری عورتوں کے مہروں سے کچھ تم سے نکل کر کافروں کی طرف چلا گیا ہے۔ پھر تمہاری باری آئے تو اُن لوگوں کو جن کی عورتیں چلی گئی ہیں اُس کی مثل دے دو جو اُنہوں نے خرچ کیا ہے) مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کی بیوی اگر کافر تھی اور وہ الگ ہو گئی تو جب تمہاری باری آئے اور کسی کافر کی عورت مسلمان ہو کر آجائے تو جو مہر کفار کی طرف لوٹانا تھا اُسے اُس مسلمان کو دے دو اس آیت کو آیت غنیمت سے منسوخ کہا گیا ہے۔ لیکن دونوں آیتوں کے موضوع میں بہت بُعد ہے اسی لیے بہت کم مفسرین نے اسے منسوخ کہا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ آیت اپنی جگہ پر محکم ہے اور جب بھی اس قسم کے حالات پیدا ہوں گے اسی پر عمل کیا جائے گا۔

۲۱۔ یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۙ (۷۳/۱-۴)

(اے ساتھی تیار کرنے والے! رات کو قیام کر سوائے تھوڑے حصّہ کے یعنی اس کا آدھا یا اس سے کچھ کم کر یا اس پر بڑھا لے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ)۔

قائلین لنسخ کہتے ہیں کہ اس کی ناسخ وہ آیات ہیں جو اسی سورت کے آخری حصہ میں وارد ہیں۔ اِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ ؕ وَ اللّٰہُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ

تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ" (تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب قیام کرتا ہے۔ اور کبھی اس کا نصف اور کبھی اس کی تہائی اور ان میں سے بھی ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہیں اور اللہ رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ تم اس کی حفاظت نہ کر سکو گے سو وہ تم پر رجوع برحمت کرتا ہے۔ پس قرآن سے جو بات بھی پڑھ سکتے ہو پڑھو، وہ جانتا ہے کہ تم میں سے بیمار ہوں گے اور دوسرے لوگ جو زمین میں سفر کریں گے اللہ کے فضل کو تلاش کرتے ہوں گے اور دوسرے جو اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے سو پڑھو جو اس سے بآسانی پڑھ سکو) (۷۳/۲۰)

قائلینِ نسخ کا استدلال یہ ہے کہ پہلی آیت میں نصف رات یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ کے قیام کا حکم کیا گیا ہے کہ آپ نصف رات، یا تہائی رات یا دو تہائی رات تک کے لیے قیام کرتے ہیں اور مسلمانوں کا ایک گروہ بھی آپ کے ساتھ ہوتا ہے چونکہ اُن پر مداومت نہ ہو سکے گی پس اللہ تعالیٰ تخفیف کرتا ہے اب آپ آسانی سے رات کے جس قدر حصہ میں قیام کر سکیں کر لیں۔ اس تخفیف سے نسخ ثابت ہوتا ہے۔

آیت کے غیر منسوخ ہونے پر مندرجہ ذیل دلائل ہو سکتے ہیں :-

(۱) سورۂ مزمل کے پہلے اور آخری حصّہ کے نزول میں حضرت عائشہ کی روایت کے مطابق بارہ مہینوں کا عرصہ حائل ہے۔ اس لیے بارہ مہینے پہلے اور بارہ مہینے بعد کے حالات میں بہت سا فرق ہو گا۔ پہلی آیت میں نبیؐ کو يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ کہہ کر مخاطب کیا ہے الزمیل کے معنی ہیں اونٹ پر بیٹھنے والا آدمی یا سفر کا ساتھی جو معاملات میں مدد کرتا ہے زَمَلَهٗ، يَزْمِلُهٗ، زَمْلًا کے معنی ہیں جس نے پیچھے سوار کر لیا یا کجاوے میں اپنے ساتھ برابر کی جھولی میں بٹھایا۔ اَلزَّمِلُ کے معنی ہیں اِزْدَمَلَ الْحِمْلَ" کے معنی ہیں

اُس نے ایک ہی دفعہ سارا بوجھ اُٹھا لیا۔ المزاملہ اونٹ پر دونوں طرف ہموزن سواریوں کا بیٹھنا یا ہموزن بوجھ لادنا کے معنوں میں آتا ہے۔ پس "یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ" کے معنی ہوئے اے بارِ رسالت کو اُٹھانے والے، اے امرِ عظیم اُٹھانے والے یا اے سفر کے ساتھی انتخاب کرنے والے۔

چونکہ ان آیات میں رفقار کی تربیت مقصود ہے اس لیے رات کے زیادہ حصہ کے قیام پر زور دیا گیا ہے۔ دوسری آیات اُس وقت کی ہیں جب تربیت کا مرحلہ گزر چکا تھا اس لیے انسانی معذوریوں کو مدِ نظر رکھ کر حکم میں تخفیف کر دی گئی۔ چونکہ دونوں آیات کے نزول کے وقت حالات مختلف تھے اس لیے دونوں آیات اپنی اپنی جگہ پر محکم ہیں۔ اگرچہ آج بھی کسی کو اپنے رفقار کی تربیت مقصود ہو گی تو وہ پہلی آیت پر عمل کرے گا۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جائے گا تو دوسری آیت پر عمل ہو گا۔

(۲) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اصل وجوب رات کا قیام ہے اور قیام کا وقت اللہ تعالےٰ نے اختیار پر چھوڑ دیا ہے۔ پہلی آیت میں "نصفہ" "اَوِ انْقُصْ منہ قلیلا" "او زِدْ عَلَیْہِ" کے الفاظ اسی اختیار پر ہی دلالت کرتے تھے اور رسولِ اکرمؐ نے اُس اختیار کو اس طرح استعمال کیا کہ نصف کے معنی نصف ہی لیے "او انقص منہ قلیلا" کے معنی ایک تہائی رات لیے اور "او زد علیہ" سے دو تہائی رات مراد لی۔ چونکہ آپ عبادت کے لیے بہت زیادہ کوشش فرماتے تھے اور آپ کو عبادت کا شوق تھا اس لیے آپؐ نے رات کو زیادہ وقت کا قیام مناسب خیال کیا جب دوسرے مسلمان بھی رات کے قیام میں آپ کے شریک ہو گئے "وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ" تو اللہ تعالیٰ نے عام انسانی مجبوریوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فیصلہ فرما دیا کہ ہر آدمی کو اختیار ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق قیام کرے۔

(۳) یہ دلیل بھی ہو سکتی ہے کہ پہلا حکم انفرادی ہے اور دوسرا حکم اجتماعی ہے، کیونکہ وہاں "وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ" کے الفاظ آئے ہیں۔ پس پہلا حکم ایک خاص وقت

تک کے لیے تھا۔ وہ وقت گذر گیا تو حکم بھی ختم ہو گیا اور جب نبی کے ساتھ مسلمانوں کا گروہ بھی قیام شب میں شریک ہوا تو دوسرے احکام نازل ہوئے۔ آج بھی اگر کوئی انہی خطوط پر کام کریگا۔ تو پہلے انفرادی حکم پر عمل کرے گا پھر اجتماعی پر۔ وگرنہ دوسرے حکم میں جو مصالح اور علل بیان ہوئی ہیں یقیناً پہلا حکم دیتے وقت بھی اللہ کے پیش نظر ہوں گی۔

(۴) اصل وجوب قیام شب کا ہے اور وہ دونوں طرح برقرار ہے، باقی رہا یہ امر کہ پہلے رات کے زیادہ حصّہ میں قیام کا حکم تھا اور پھر اسے کم کر دیا گیا تو اس کی علت یہ ہے کہ یہ حکم حسب استطاعت ہے۔ اسی طرح دوسری آیت پہلی آیت کی تشریح و توضیح کر رہی ہے، اسے منسوخ نہیں کر رہی۔

جو لوگ ناسخ منسوخ کے قائل ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم مصلحت پر مبنی ہے یہ الگ بات ہے کہ زمانہ کے تغیر کے ساتھ مصلحت بھی بدل جاتی ہے اور تدریجی ارتقا کے سلسلہ میں مختلف مقامات آتے ہیں اور اُن کی مصالح کے پیشِ نظر تدریجی احکام صادر ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) اللہ نے ایک وقت میں بے سوچے سمجھے ایک حکم دے دیا پھر بارہ مہینوں کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ "میرا فیصلہ (نعوذ باللہ) غلط تھا"، پھر اس کے خلاف دوسرا حکم صادر کر دیا۔

۲۲۔ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (۲/۱۱۵)

(پس جدھر تم پھرو گے پس وہیں پاؤ گے مُنہ اللہ کا)۔

اس آیت کو تحویلِ قبلہ والی آیت سے منسوخ سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس آیت میں قبلہ کا کوئی ذکر نہیں چونکہ اس سے پہلے کی آیت میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کو مساجد سے یا خدا کی عبادت سے روکا جاتا ہے اِس لیے یہاں مسلمانوں کو تسلی دی کہ اگر انہیں خانہ کعبہ سے روکا گیا تو اللہ کی توجہ صرف خانہ کعبہ پر محدود نہیں، وہ جہاں جائیں گے اللہ کی توجہ وہیں اُن کے ساتھ ہوگی۔ اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ مسلمان جدھر جائیں گے اللہ کی توجہ سے فتح و ظفر اُن کی ہم رکاب ہوگی۔

کیونکہ مشرق و مغرب کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ پھر اگر "فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا" سے صلوٰۃ میں منہ پھیرنا ہی مراد لیجیے تب بھی آپ آیت کو منسوخ نہیں کہہ سکتے۔ ہم کہیں گے کہ وہ خاص حالات سے مخصوص ہے۔ جب آدمی کو قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو تو جدھر بھی وہ چاہے منہ کر کے صلوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔ پس یہ آیت اپنے حکم میں باقی ہے۔

یہ ہیں وہ مقامات جہاں امام جلال الدین سیوطیؒ نے نسخ تسلیم کیا۔ ان میں سے بھی دو کو خود امام سیوطیؒ نے ساقط کر دیا ہے۔ باقی بیس آیات آپ نے دیکھ لیں کہ ابو مسلم نے اُن کی تشریح بھی کر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن میں نسخ نہیں تو آخر اُس آیت کا کیا مفہوم ہے جو اس کی ابتدا میں درج کی گئی ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو کوئی اس سے بہتر یا اس کے مثل لے آتے ہیں۔)

ابو مسلم اس آیت کی تفسیر میں نئی راہ نکالتے ہیں۔

سب سے پہلے اُن الفاظ پر غور کیجیے جن میں قائلین نسخ استدلال کرتے ہیں۔

نَسْخٌ کے معنی ہیں ایک چیز کو ختم کر دینا، مٹا دینا اور اُس کی جگہ دوسری چیز لے آنا۔ دوسری چیز کو پہلی چیز کا قائم مقام کر دینا۔ نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ کے معنی ہیں سورج نے سایہ کو ختم کر دیا۔ اور اس کی جگہ روشنی لے آیا۔ کسی چیز میں تغیر کر دینے کا مفہوم ادا کرنے کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے نَسَخَتِ الرِّیْحُ اٰثَارَ الدِّیَارِ ہواؤں نے آبادی کے آثار کو تبدیل کر دیا نَسَخَ الْکِتَابَ ایک کتاب کو نقل کر کے اس جیسی دوسری کتاب بنانا۔ اسی سے النسخہ ہے جو منقول کتاب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا "نسخ" کے اصلی معنی ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لانا ہیں۔

"نِسْیَانٌ" کے معنی ہیں ترک کر دینا۔ چھوڑ دینا۔ حفاظت سے ہاتھ اُٹھا لینا۔

"النَّسِیُّ" ایسی چیز کو کہتے ہیں جسے حقیر اور غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کی جمع

اَنْسَاءٌ" ہے۔ جب عربوں کا قافلہ کوچ کرنے لگتا تو وہ پکارتے تَتَبَّعُوا اَنْسَاءَکُمْ اپنی اُن چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کو بھی تلاش کر لو جنہیں اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس عدمِ اہمیت کی بنا پر اس لفظ کے معنی فراموش کر دینے اور بھول جانے کے ہو گئے۔ "اَنْسَاهُ اِیَّاهُ"۔ اُس نے اس کو بھلا دیا۔ نَسَّاءٌ بہت بھول جانے والا۔ نَسْیًا مَنْسِیًّا کے معنی ہوئے بھولی بسری۔

اِن توضیحات کے بعد اب قائلینِ نسخ کے بتاتے ہوئے مفہوم پر غور کیجیے۔ اس مفہوم سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآنِ حکیم میں بیشتر احکام ایسے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے یا تو بدل دیا اور یا پھر نبی صلعم کے حافظہ سے بھلا دیا۔ ان احکام کی بجائے اللہ نے یا تو دوسرے احکام صادر کر دیے یا انہی جیسے احکام پھر سے نازل کیے گئے۔ (نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا)

"اَوْ مِثْلِهَا" کے مفہوم پر غور کیجیے اگر پھر خدا کو ویسے ہی احکام صادر کرنے تھے تو پہلے احکام کو مٹا دینے یا بھلا دینے کی کیا ضرورت تھی۔ نسخ سے یہ عقیدہ لازماً پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا یہ حال ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حکم معاذ اللہ غلط تھا اِس لیے وہ حکم خدا منسوخ کر دیتا ہے اور اُس کی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ قرآنِ حکیم میں خدا نے کوئی تصریح بھی نہیں کی کہ فلاں آیت فلاں آیت سے منسوخ ہے۔ نہ ہی سرورِ کائنات صلعم نے واضح فرما دیا کہ قرآنِ حکیم کی فلاں آیت فلاں آیت سے منسوخ ہو گئی۔

اب اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھیے۔

پیچھے سے سلسلۂ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہلِ کتاب بالخصوص یہود قرآنِ حکیم اور رسالتِ محمدیہ پر اعتراضات کے سلسلہ میں یہ بھی کہتے کہ جب خدا نے پچھلے انبیاء پر احکام نازل فرمادیے اور وہ احکام توریت میں محفوظ بھی ہیں تو نئے نبی کی کیا ضرورت تھی کہ اُنہیں نئے احکام دے کر بھیجا گیا؟ یہ آیت اِسی اعتراض کے جواب میں وارد ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب

دیا گیا ہے کہ "ٹھیک ہے کہ انبیاء کا سلسلۂ رشد و ہدایت مسلسل چلا آرہا ہے۔ مگر اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو احکام نازل ہوتے تھے ان میں سے کچھ وقتی ہوتے تھے اور خاص قوم اور خاص حالات کے لیے ان کا نزول کیا جاتا تھا بعد میں جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضے بدل جاتے تو ایک اور رسول آتا اور وہ ان وقتی احکام کی جگہ دوسری قوم کے حالات کے مطابق احکام لے آتا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائے تو توریت کے بہت سے احکام بدل گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسانیت ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اس لیے ہر زمانے میں اُس وقت کی ارتقائی سطح کے مطابق احکام نازل کیے گئے اور جو احکام اس سطح سے بلند ہوتے انہیں آئندہ وقت کے لیے روک لیا جاتا۔

پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ سابقہ انبیاء کے وہ تمام قوانین جو وقت اور حالات سے مقید تھے انہیں منسوخ کر دیا گیا ہے اور اب چونکہ انسانیت ترقی کے راستے طے کرتی ہوئی اس منزل پر آ پہنچی ہے اس لیے اسے ایک ابدی ضابطۂ حیات دے دیا گیا ہے اس ضابطۂ حیات میں پچھلی شریعتوں کے کچھ احکام کو منسوخ کر دیا گیا ہے اور کچھ کو علیٰ حالہٖ باقی رکھا گیا ہے۔ آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا۔

"پچھلی شریعتوں کے احکام کو ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا ترک کر دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر، اس جیسا کوئی اور حکم لے آتے ہیں۔"

آیت کا اگلا حصہ ہے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں یعنی خدا جانتا ہے کہ انسانوں کے کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہییں اور وہ دور کب آئے گا جب اسے مکمل نظامِ زندگی دے کر اسے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا جائے۔

یہ ہے ناسخ منسوخ کا صحیح مفہوم جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں اس کے تمام احکام اپنی جگہ محکم اور غیر متبدل ہیں کیونکہ پچھلی نبوتیں کسی خاص قوم سے

تعلق رکھتی تھیں اور سرورِ کائنات صلعم کی نبوت تمام اقوامِ عالم کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔

اب رہا قائلین نسخ کا یہ اعتراض کہ آیۂ زیر بحث میں "آیت" کے منسوخ ہونے کا ذکر ہے اور "آیت" کا لفظ صرف قرآنی آیات پر ہی بولا جاتا ہے۔ پچھلے احکام پر استعمال نہیں ہوتا تو یہ دلیل محض بے معنی ہے، اللہ کے تمام احکام کو "آیات" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قصۂ آدم کے سلسلہ میں اللہ نے آدم سے ارشاد کیا "فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا .... ($\frac{۲}{۳۸-۳۹}$) (جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو اس کی اتباع کرے گا اُسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا اور جو لوگ ہماری "آیات" کی تکذیب کریں گے اور ان کا انکار کریں گے .....) یہاں سے ظاہر ہے کہ جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی اُسے "آیات" سے تعبیر کیا گیا۔

قائلینِ نسخ سورۂ نحل کی اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ ۙ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ (اور جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم بھیجتے ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے جو وہ اُتارتا ہے تو کہتے ہیں تو تو افترا کرنے والا ہے)۔ غور کیجیے تو یہ استدلال بھی کمزور ہے با دنیٰ تدبر یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ قرآنی آیات کے نسخ کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ اس کے لیے ہم چند دلائل بیان کرتے ہیں :۔

(ا) یہ قول کفار کا ہے اس لیے انہیں تو اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوسکتا کہ وہ کہیں کہ آج کونسا قرآنی حکم منسوخ ہوا اور کون کا حکم قائم ہوا۔

(ب) سیاق سباق میں ناسخ منسوخ کی کسی بحث کا ذکر نہیں اصل موضوع ہے کفار کے مقابلہ میں وحی کی صداقت کو ثابت کرنا اس سے اگلی آیت ($\frac{۱۶}{۱۰۳}$) میں کفار کا واضح قول ذکر

کیا گیا ہے کہ "ایک بشر آپ کو سکھاتا ہے"۔

(ج) یہ سورت مکی ہے اور جن آیات کو ناسخ شمار کیا گیا ہے وہ تمام مدینہ میں نازل ہوئی تھیں جب مکہ میں شریعت کے تفصیلی احکام نازل ہوئے تو منسوخ کونسی چیز ہوئی اور یہ اس بابت کی قطعی دلیل ہے کہ اس آیت میں قرآن کے ناسخ منسوخ کا ادنیٰ اشارہ بھی نہیں ملتا۔

(د) اس سے متصل بعد والی آیت میں اس کے نزول کی غرض یہ بتائی گئی لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ٥ (١٦/١٠٢) (تاکہ اُنہیں مضبوط کرے جو ایمان لائے اور وہ فرماں برداروں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے)۔ یہ ایک آیت کی نہیں بلکہ تمام قرآن کی شانِ نزول ہے جیسا کہ سورۂ الفرقان میں فرمایا "لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ" پس یہاں "آیت کے بدلنے سے نئی رسالت کا آنا مراد ہے اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ اس سے پیشتر دوسرے انبیاء کا ذکر کیا تھا جو اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے (١٦/٨٤ ، ١٦/٨٩) اب کفار کی طرف سے یہ اعتراض پیدا ہوا کہ جب پہلے انبیاء آ چکے تھے تو نئی کتاب اور نئے رسول کی کیا ضرورت تھی۔ کیوں اس نے پچھلی شریعتوں کو منسوخ کر دیا"۔ اس لیے اُنہوں نے کہا کہ یہ تو بہر حال افترا ہے اس کا جواب دیا کہ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (١٦/١٠٢) (فرما دیجیے کہ اس کو روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اُتارا ہے۔)

پس اس آیت میں بھی آیت کی تبدیلی سے مراد پچھلی شریعتوں کے احکام کی تبدیلی ہے۔

قائلین النسخ کی ایک دلیل بھی سن لیجیے وہ کہتے ہیں کہ نسخ والی آیت میں جہاں "اَوْ نُنْسِهَا" آیا ہے اس کا واضح مفہوم یہی ہے کہ نبی اکرم کچھ آیات بھول جاتے تھے اس پر یہ آیت دلیل ہے "سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ"۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے (ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا، ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے) (٨٧/٦)

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں نے "اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ" کا مفہوم نہیں سمجھا

اِس فقرہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو ایسا ہو سکتا تھا کہ تو کچھ بھول جائے لیکن اللہ کی یہ مشیت نہیں۔ دوسری جگہ اس مفہوم کو ایک اور انداز سے بیان کیا گیا ہے" وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ (۱۷/۸۶) (اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ بذریعہ وحی دیا گیا ہے اُس میں سے کچھ لے جائیں (لیکن ہماری مشیت ایسی نہیں).

اصل یہ ہے کہ "استثنار بالمشیت" قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لیے آتا ہے۔ یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَا شَآءَ اللهُ وغیرہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسا پہلے کہہ دیا گیا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا۔ اس کی دلیل وہ آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ (۱۱/۱۰۸) (اور وہ جو خوش قسمت ہیں وہ جنت میں ہوں گے، اُسی میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں مگر جو تیرا رب چاہے یہ بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔)

پس یہاں "اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ" کا مفہوم وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ قائلین نسخ کے یہی کچھ دلائل تھے جنہیں رد کر دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اُن کے پاس اور کوئی دلیل نہیں۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ کے مخاطب کون ہیں؟

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۭ (۲/۱۰۸)

بلکہ تم تو یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو جیسے سوالات پیش ازیں موسیٰؑ سے کیے گئے۔

عام مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں یہود سے خطاب کیا گیا ہے نزلت فی الیھود (معالم التنزیل)۔ دوسرے قول بھی نقل کیے گئے ہیں لیکن راجح قول یہی سمجھا گیا ہے۔

"وَ دَجہ انہم الیھود" (بحر) لیکن اصم، جبائی، اور ابومسلم کے نزدیک مخاطب مسلمان ہیں۔ اُنہوں نے کئی وجوہ سے استدلال کیا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا وَ مَنۡ یَّتَبَدَّلِ الۡکُفۡرَ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ (اور جو کوئی ایمان کو کفر سے بدل لے گا سو وہ یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔)

اور یہ کلام مسلمانوں کے سوا کسی کے حق میں صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہود یا مشرکین وغیرہ کے لیے تو ایمان کو کفر سے بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ کے لیے معطوف علیہ کی ضرورت ہے اور وہ لَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا ہے پس گویا یوں فرمایا کہ "و قولوا انظرنا و اسمعوا فهل تفعلون ذلك كما أمرتم ام تريدون ان تسئلوا رسولكم۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک ضعیف الاعتقاد گروہ نے رسولِ اکرم صلعم سے سوال کیا کہ ان کے لیے کوئی درخت مقرر فرما دیں جیسا مشرکوں کے لیے ذات انواط تھا جس کو وہ پوجتے تھے اور اُس پر کھانے پینے کی چیزیں لٹکا آتے تھے ایسا ہی سوال بنی اسرائیل نے بھی حضرت موسیٰ سے کیا تھا اجعل لنا الٰهًا كما لهم آلهة۔

سب سے بڑا ظلم

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡهَا اسۡمُهٗ وَسَعٰی فِیۡ خَرَابِهَا (۲/۱۱۴)

اور اُس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو روکے اللہ کی مسجدوں میں اُس کا نام لینے سے اور اُن کی بربادی کی کوشش کرے۔

ابومسلم کے نزدیک یہ مشرکین مکہ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے واقعۂ حدیبیہ میں مسلمانوں کو مسجد حرام تک جانے سے روکا تھا۔

دوسری جگہ انہی لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے الذین کفروا

وَصدوکم عن المسجد الحرام۔ رہا یہ سوال کہ مساجد جمع ہے پھر اُسے واحد کے معنوں میں لے کر مسجد حرام کیوں مراد لی گئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ محاورۂ زبان میں یہ جائز ہے۔ مثلاً اگر کوئی آدمی کسی نیک آدمی کو ستائے تو کہا جاتا ہے نیکوں کو ستانے والا بڑا ظالم ہے۔ کما تقول لمن اذیٰ صالحاً واحداً و من اظلم ممن اذیٰ الصالحین۔

مشرق و مغرب اللہ کے ہیں

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (۱۱۵) آپ کہہ دیجیے کہ مشرق و مغرب اللہ کے ہیں۔

ابو مسلم کہتے ہیں یہود اور نصاریٰ میں سے ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ جنت اُن کے سوا کسی کے حصہ میں نہ آئے گی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت سے اُن کے اقوال کا ابطال کرتا ہے۔ یہود بیت المقدس (مغرب) کی طرف صرف اس لیے مُنہ کرتے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ صخرۂ بیت المقدس سے ہی آسمان پر چڑھا تھا اور عیسائی جو عیسیٰ علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) اللہ کا بیٹا سمجھتے تھے صرف اس لیے مشرق کو قبلہ قرار دیتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام مشرق میں پیدا ہوئے تھے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا۔ مریم کے حالات یاد کرو جب کہ وہ گھر والوں سے الگ مشرقی مکان میں گئی

پس ان دونوں فریقوں نے اپنے معبودوں کو خاص خاص مکان میں مقید سمجھا ہے اور جس کی صورت ایسی ہو وہ تو مخلوق ہوگا خالق تو نہ زمان میں مقید ہے نہ مکان میں بلکہ یہ جہات اُس کی ملک ہیں۔

تحویلِ قبلہ

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مَا وَلَّاهُمْ مِنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۲/۱۴۲)

اب بے وقوف لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے مسلمانوں کو اُس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ اب تک تھے، فرما دیجیے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں وہ جس کو چاہے سیدھی راہ پر چلا دیتا ہے۔

ابو مسلم کا قول ہے کہ اگر روایت میں صاف طور پر مذکور نہ ہوتا کہ اللہ نے حضور کو بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کی طرف مُنہ پھیرنے کا حکم دیا تو آیت کے الفاظ کانوا علیھا اس بات پر بھی محمول کیے جا سکتے تھے کہ "وہ قبلہ جس پر بے وقوف تھے"، کیونکہ وہ مشرق و مغرب ان دو قبلوں کے سوا کسی قبلہ سے واقف نہ تھے، اور جب اُنھوں نے رسولِ خدا صلعم کو کعبہ کی طرف منہ کرتے دیکھا تو متعجب ہوئے کہ ان دو جہتوں کو چھوڑ کر یہ تیسرا قبلہ کیسا؟ پس اللہ نے کہا کہ مشرق و مغرب سب جہات اللہ کی ہیں وہ جدھر حکم دے مُنہ پھیر لو[1]۔

اُمّتِ وُسطیٰ

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ (۲/۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسطیٰ بنایا ہے تاکہ تم گواہ ہو لوگوں پر اور رسول گواہ رہیں تم پر۔

ابو مسلم کا قول ہے کہ جس طرح ہم نے تمہیں ایک افضل عظیم اور مثالی قبلہ عطا کیا ہے اسی طرح تمہیں بھی ایک اُمت عادل اور مثالی قوم بنایا ہے تاکہ تم دنیا کی دوسری قوموں

---

[1] بات صاف نہیں ہوئی۔ (مترجم)

کے لیے اُسوہ حسنہ بنے رہو اور حضور تمہارے لیے اُسوہ حسنہ ہوں - حدیث میں بھی اُمت وسطیٰ کے معنی اُمت عادل کے لیے گئے ہیں - عن ابی سعید الخدری عن النبی صلعم امة وسطا قال اُمة عدلا (عن احمد)

کنت علیہا سے کیا مراد ہے

وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ (۲/۱۴۳)

اور جس قبلہ پر آپ اب تک تھے اُس نے تو ہم نے اسی لیے کیا تھا کہ پہچان لیں رسول کے متبعین کو اُلٹے پاؤں واپس چلے جانے والوں سے -

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اگر روایات سے ثابت نہ ہوتا کہ حضور پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے رہے تو کہا جا سکتا تھا کہ کنت (تو تھا) صرت (تو ہوا ہے) کے معنی میں آیا ہے جس طرح اللہ کا ارشاد ہے کَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا اس میں صرف کان ماضی کے لیے نہیں اسی طرح اس آیت میں بھی کہا جا سکتا تھا کہ موجودہ قبلہ یعنی کعبہ کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اسے ہم نے اسی لیے قبلہ مقرر کیا کہ سچے اور جھوٹے ممیز ہو جائیں -

ایمان ضائع نہیں ہوگا

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ (۲/۱۴۳)

اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع ہو جانے دے تمہارے ایمان کو -

ابو مسلم کے نزدیک اس کا تعلق اہل کتاب میں سے اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو ایمان لے آئے اُنہیں کہا جا رہا ہے کہ ایمان لانے سے پہلے کی نمازیں جو اس قبلہ پڑھی گئی تھیں ضائع نہیں ہوئیں، اُس شریعت میں قبلہ وہی تھا جو اب منسوخ ہو گیا -

حکم کا انتظار

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْھِکَ فِی السَّمَآءِ (۲/۱۴۴) — بلاشک ہم نے دیکھ لیا آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا۔

ابو مسلم کے نزدیک اگر روایات نہ ہوں تو آیت کے الفاظ سے اَور معانی کا احتمال ہے۔ یعنی حضورؐ جب پہلے پہل مدینہ تشریف لائے تو رُخ کعبہ کی طرف پھیر لیا۔ کیونکہ مکہ میں تو حضورؐ ایسی جگہ نماز پڑھتے تھے کہ رُخ بیت المقدس کی طرف بھی رہتا اور کعبہ کی طرف بھی۔ مدینہ میں آئے تو قبلہ کے متعلق حکم کا انتظار کرنے لگے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا فَوَلِّ وَجْھَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔

خدا کا بندوں کو یاد کرنا

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (۲/۱۵۲) — مجھے یاد کرتے رہو میں تمہیں یاد کرتا رہوں گا۔

ابو مسلم کا قول ہے کہ اللہ بندوں کو حکم دے رہا ہے تم مجھے اپنی دعاؤں میں یاد کرو اور میں ان کی قبولیت میں تمہیں یاد کروں گا۔ جیسا کہ دوسری جگہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (یعنی تم مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔)

پس اگر بندے اُسی پر بھروسہ کر کے اُسی سے خائف ہو کر، اُسی کی محبت اپنے دل میں بسا کر اور شرک کی نجاست سے پاک ہو کر اُسے پکاریں تو اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت کی شان کو حرکت میں لائے گا۔

شہداء کی زندگی

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ — اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں اُنہیں

سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲/۱۵۴) — مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں البتہ تم ادراک نہیں کر سکتے۔

شانِ نزول میں تمام مفسرین کا متفقہ بیان ہے کہ غزوۂ بدر میں جب کچھ صحابیؓ شہید ہو گئے تو منافقوں نے کہنا شروع کیا کہ انہوں نے خواہ مخواہ اپنی زندگی گنوا دی اور اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہو گئے۔ انہیں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

شہدا کی زندگی کے معاملے میں مفسرین مختلف الرائے ہیں بعض کہتے ہیں کہ عالمِ برزخ میں انہیں طرح طرح کے لذائذ مل رہے ہیں اور ان کی زندگی روحانی زندگی ہے۔ کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ انہیں روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی زندگی حاصل ہے۔ لیکن ابومسلم اصفہانی کو ان اقوال سے اختلاف ہے اُن کی رائے یہ ہے کہ "دراصل یہ آیت منافقین کے اس پروپیگنڈے کا جواب ہے کہ شہدا مفت میں زندگی جیسی نعمت سے محروم ہو گئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ تمہاری طرح نہیں کہ تمہاری بعد کی زندگی بہت ہی ذلت آمیز موت سے بھی بدتر ہوگی۔ وہ تو زندہ کیے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی عنایات سے سرفراز فرمائے گا۔ یعنی وہ ہمیشہ کے لیے مٹی میں نہیں مل گئے بلکہ وہ زندہ ہو کر اپنے رب سے انعام پائیں گے۔" "اَحْيَآءٌ" کے معنی زندہ ہونے والے کے ہیں۔ یہ اسمِ فاعل "حی" کی جمع ہے اور اس کے معانی حال اور استقبال دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں جیسے "میت" کا لفظ ہے کہ مُردہ پر بھی بولا جاتا ہے اور آئندہ مرنے والے پر بھی۔ کتاب اللہ میں ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ — اے نبی! آپ بھی فوت ہونے والے ہیں اور یہ کفار بھی مرنے والے ہیں۔

اسی طرح "احیاء" کے معنی "زندہ" بھی ہو سکتے ہیں اور "زندہ ہونے والے" بھی۔ مؤخر الذکر معانی مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اور بھی کئی مثالیں قرآن میں موجود ہیں جو

صاف حال کے لیئے ہیں لیکن کوئی بھی انہیں حال سے متعلق نہیں مانتا۔ بلکہ ہر مومن انہیں مستقبل پر قیاس کرتا ہے۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ وَ — بلاشبہ نیک جنت میں ہیں اور برے
إِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ — دوزخ میں۔

ظاہر ہے ابرار اور فجار کا فیصلہ قیامت کے روز ہوگا اور پھر انہیں جنت اور دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔

دوسری جگہ ہے۔ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (بے شک منافق دوزخ کے انتہائی عمیق حصے میں ہیں۔ اور فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ پس جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اعمال صالحہ کیئے وہ جنت میں ہیں۔)

ان تمام آیات میں جب یہی مفہوم لیا جاتا ہے کہ مستقبل میں ایسا ہوگا تو پھر شہدار کی زندگی کے معاملہ میں کیوں "اَحیاءٌ" جیسے واضح لفظ کو حال پر قیاس کیا جائے۔

کعبی بھی اس تفسیر میں ابومسلم سے متفق ہیں۔ اصم نے یہ تاویل کی ہے کہ شہدار تمام کی عمر جیتے ہیں جیسے بقراط اپنے شاگردوں کو کہا کرتا تھا کہ جسم کے ساتھ مرو لیکن روح کے ساتھ زندہ جاوید ہو جاؤ۔

رہا یہ سوال کہ قیامت کے روز تو تمام مُردے زندہ کیئے جائیں گے پھر شہدار کی کیا خصوصیت تھی کہ ان کے متعلق اس عظمت اور شان کے ساتھ آیت اُتاری گئی۔ اس کا ایک الزامی جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ ان کی روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی زندگی کے قائل ہیں ان سے پوچھا جائے کہ شہدار اگر روح اور جسم کے ساتھ زندہ ہیں تو ان سے ہزار گنا بہتر زندگی انبیار اور صدیقین کو حاصل ہوگی، پھر شہدار کی زندگی میں کونسی خصوصیت تھی کہ اسے تو بیان کیا گیا مگر انبیار صدیقین صلحار اور اولیار کی زندگی کا کہیں تذکرہ نہ ہوا۔ جو لوگ صرف روحانی زندگی کے قائل

ہیں اُن پر بھی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کفار اور منافقین شہدائے بدر کے متعلق جو کچھ مشہور کر رہے تھے اللہ نے اُن کے جواب میں یہ آیت نازل کی ہے۔ چونکہ موضوع یہی تھا اس لیے دوسرے لوگوں کا ذکر نہ چھیڑا گیا۔

ابو مسلم نے آلِ عمران والی آیت سے بھی استدلال کیا ہے جس میں اَحْيَاءٌ کے ساتھ عِنْدَ رَبِّهِمْ کے الفاظ بھی آئے ہیں ابو مسلم کا استدلال یہ ہے کہ ان کا اللہ کے نزدیک زندہ ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس وقت کسی جگہ زندہ نہیں بلکہ جنت میں انہیں جگہ ملے گی کیونکہ جنت میں قیامت سے پہلے کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔

اَللّٰعِنُوْنَ کا صحیح مفہوم

يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ۔ ($\frac{۲}{۱۵۹}$) — اُن پر (کفار پر) اللہ اور لعنت کرنے والے لعنت کریں گے۔

مفسرین "لاعنون" میں جن، انس اور ملائکہ کو شامل سمجھتے ہیں اور اُن کی طرف سے لعنت کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ جن و انس اور ملائکہ اللہ سے درخواست کریں گے کہ انہیں فضل و کرم سے محروم کیا جائے بمعنی الدعاءِ علیهم بالابعاد عن رحمة الله تعالیٰ۔ (روح المعانی)

لیکن ابو مسلم کو اس تفسیر سے اختلاف ہے، وہ لاعنون سے صرف مسلمان مراد لیتے ہیں اور لاعنون کے لعنت کرنے کے معاملہ میں بھی مفسرین سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں لعنت یہ ہے کہ مسلمان ان سے کسی قسم کا تعاون نہ کریں، پوری سختی سے اُن کی مخالفت کریں اور اُن سے بیزار ہو جائیں۔ مفسرین کی تفسیر پر اُنہیں یہ اعتراض ہے کہ جب اللہ خود اُن پر لعنت کرتا یعنی اپنی رحمت سے دور کرتا ہے، تو پھر جن، انس اور ملائکہ کی یہ دعا کہ اے اللہ انہیں رحمت سے دور رکھ بے معنی نہیں تو اور کیا ہے۔؟

کفر پر مرنے والے

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ ھُمْ کُفَّارٌ (۲/۱۶۱) — جو لوگ کافر ہوئے اور کفر کی حالت میں ہی مر گئے۔

ابو مسلم کے نزدیک یہ وہی لوگ ہیں جو حق کو چھپاتے ہیں اور اسی حالت میں مر جاتے ہیں۔ تو اس زندگی کے بعد کی زندگی میں بھی وہ مغضوب اور ملعون رہتے ہیں۔

تخلیقِ ارض و سمٰوٰت

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲/۱۶۴) — بے شک تخلیق ارض و سمٰوٰت میں۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ کلامِ عرب میں خلق، تقدیر کے معنوں میں آتا ہے اور اسی لیے اس اسم کا اطلاق اللہ کے افعال پر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام درست ہیں۔ ارشادِ باری ہے۔ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا۔ اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کے لیے قانون بنایا۔ ہر امرِ محکم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تقدیر کے مطابق ہے۔

کِتمانِ حق

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (۲/۱۷۴) — بے شک وہ لوگ جو اللہ کی نازل کی ہوئی چیز چھپاتے ہیں۔

اِس امر میں اختلاف ہے کہ وہ کونسی چیز چھپاتے تھے۔ ابن عباس، قتادہ، سدی ابو مسلم اور اصم کا خیال ہے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف اشارہ ہے جو سرورِ کائنات صلعم کے متعلق توریت اور انجیل میں بیان کی ہوئی پیش گوئیاں اور بشارتیں چھپاتے تھے۔

اختلاف فی الکتاب کا صحیح مفہوم

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ۠ (۲/۱۷۶)

اور بے شک جو لوگ کتاب کے بارے میں اختلاف ڈال رہے ہیں وہ بہت دور دراز کے اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔

ابو مسلم کا خیال ہے کہ اختلف باب افتعل سے ہے جو فعل کے قائم مقام بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کسب اور اکتسب، عمل اور اعتمل، کتب اور اکتتب۔ اس طرح آیت کے یہ معنی ہوں گے، جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا تو یہ اکیلا ان کا اپنا فعل نہیں بلکہ یہ فعل پیچھے سے چلا آتا ہے اور گویا انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ اختلاف میں یہی مفہوم پنہاں ہے کہ یہ لوگ اسلاف کے نائب ہوئے۔ ایک اور جگہ ہے فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ۔ ان کے بعد ان کے نائب آئے۔

اسی طرح اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ یعنی ان میں سے رات دن ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ یا جیسا کہ اس آیت میں ہے کہ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ یعنی ان میں سے ایک دوسرے کے بعد آتا ہے۔

روزہ قے سے نہیں ٹوٹتا

وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ (۲/۱۸۷)

اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ تمہارے لیے صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہو جائے۔ پھر روزہ کو رات ہوتے تک پورا کرو۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ کھانا، پینا اور مباشرت کرنا بس یہ تین چیزیں ہیں جن سے روزہ

ٹوٹ جاتا ہے ان کے علاوہ کسی چیز سے نہیں ٹوٹتا۔ اور جن چیزوں کا فقہار ذکر کرتے ہیں تو وہ مخواہ مخواہ کا تکلف ہے جیسے قئے، حقنہ، اور ناک میں دوائی ڈالنا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس سے روزہ ٹوٹتا ہو، کیونکہ اصل میں تمام چیزیں مباح تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے روزہ دار پر تین چیزیں حرام کیں کھانا، پینا اور مباشرت اور باقی جو کچھ رہ گیا وہ اپنی اصلی حلت میں ہے۔ پس ان میں سے کسی چیز سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔

حُدودُ اللہ

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا (۲/۱۸۷)

یہ اللہ کے ضابطے ہیں پس ان سے نکلنے کے قریب نہ جانا۔

ابومسلم کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ یہ حدود اللہ ہیں پس ان میں تبدیلی کا یا ان کو توڑنے کا خیال بھی نہ کرو۔ جیسے فرمایا۔ فَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ۔ پس مال یتیم کے قریب بھی نہ بھٹکو۔

آیات سے کیا مراد ہے

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ (۲/۱۸۷)

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات بیان کرتا ہے۔

ابومسلم کے نزدیک آیات سے مراد مبینہ فرائض ہیں جس طرح اللہ کا ارشاد ہے۔ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا وَ اَنْزَلْنَا فِيْهَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ۔ پھر آیات کی تشریح تمام ایسے احکام سے کی ہے جو زنا کی حد وغیرہ سے متعلق ہیں۔ پس گویا اللہ نے فرمایا کہ لوگوں کے لیے شریعت کے فرائض بیان کیے گئے تاکہ وہ برائی سے بچیں اور احکام خداوندی کی پابندی کریں۔

اصل نیکی

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (۲/۱۸۹)

اور یہ تو کوئی نیکی نہیں کہ تم گھروں میں پچھواڑے کی طرف سے آؤ البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقوے اختیار کرے۔ اور گھروں میں اُن کے دروازوں سے ہی آؤ اور اللہ سے تقوے اختیار کیے رہو تاکہ فلاح پا جاؤ۔

انصار مدینہ میں دور جاہلیت سے یہ رسم تھی کہ جب وہ حج یا عمرہ احرام باندھ لیتے تو اپنے اور آسمان کے درمیان کسی چیز کا حائل ہونا اُس وقت تک ناجائز سمجھتے جب تک احرام کھول نہ لیتے۔ اسی لیے جب وہ حج سے واپس آتے تو دروازوں سے نہ گزرتے کیونکہ اس طرح اُن کی مزعومہ نیکی ختم ہو جاتی۔ پس وہ دروازوں سے گزرنے کی بجائے پچھواڑے سے چھت پھاند کر آتے۔ اللہ نے حکم دیا کہ یہ کوئی نیکی نہیں اصل نیکی یہ ہے تقویٰ شعار بنو۔

فتنہ کے معنی

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ (۲/۱۹۳)

اور اُن سے جنگ کرو حتےٰ کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے خاص ہو جائے۔

ابومسلم کے نزدیک یہاں فتنہ سے آزمائش مراد نہیں بلکہ یہاں یہ لفظ جرم اور ظلم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

حج اور عمرہ

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (۲/۱۹۶)

اور حج اور عمرہ پورا کرو اللہ کے لیے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حج کا یا عمرہ کا قصد کریں تو لازماً دہ اسے پورا کریں۔ اس تاویل کی صحت پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی جب کفارِ مکہ نے نبی اکرمؐ کو حج اور عمرہ سے روکا تھا پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب اس کام کا ارادہ کر لیا جائے تو اسے انجام تک پہنچایا جائے مجبوری الگ چیز ہے۔ یہیں سے یہ فقہی مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ نفلی حج اور عمرہ کا جب قصد ہو جائے اور آدمی نکل کھڑا ہو تو اُن کو بھی فرضی حج کی طرح پورا کرنا واجب ہے۔

عِقاب کا مفہوم

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ (۲/۱۹۶) اور اچھی طرح جان لو کہ اللہ شدید العقاب ہے

ابو مسلم کے نزدیک عقاب عاقبت سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں بُرے کام کا انجام۔

حج کے بعد تجارت کی اجازت

وَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ (۲/۱۹۸) اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنے رب کے ہاں تلاش معاش کرو۔

ابو مسلم کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ تم حج کے تمام افعال احکام الٰہی کے مطابق انجام دو اس کے بعد کوئی مضائقہ نہیں کہ تم رزق تلاش کرو۔ اس کی نظیر سورہ جمعہ کی آیت ہے۔

وَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانۡتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ۔

(اور نماز پوری کر لو تو زمین میں بکھر جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو یعنی نماز کے بعد اپنی روزی کی تلاش میں نکل جاؤ۔

كَذِكۡرِكُمۡ اٰبَآءَكُمۡ سے مراد

فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَذِكۡرِكُمۡ اٰبَآءَكُمۡ پس یاد کرو اللہ کو اپنے آباؤ اجداد کی طرح

اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا۔ (۲/۲۰۰) بلکہ یہ یاد اس سے بھی بڑھ کر ہو۔

ابو مسلم کا خیال ہے کہ والدین کی یاد بطور مثال پیش کی گئی ہے کہ جس طرح والدین کی یاد دوامی ہوتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ اللہ کی یاد ہونی چاہیے تمہیں ہر وقت اسی کا خیال ہونا چاہیے۔

شیطان کی دشمنی

اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (۲/۲۰۸) بے شک وہ (شیطان) تمہارا کھلا دشمن ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک مبین صفاتِ بلیغہ میں سے ہے جیسے حٰمٓ وَ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ یہ دنیا آزمائش گاہ ہے اور اس میں ہر آدمی کو اختیار ہے کہ نیکی اور بدی کی راہوں میں سے جس راہ پر چاہے چلے، اس دنیاوی زندگی تک تو ہمارے اختیارات ہیں مگر اگلی دنیا میں تمام اختیارات خدا کے ہوں گے پس انسان کو چاہیے کہ وہ ہر کام میں خدا کی رضا کو مدنظر رکھے اور شیطان سے بچنے کی کوشش کرے۔

دنیا کی زندگی

زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا۔ (۲/۲۱۲) دنیا کی زندگی کفار کی نظر میں خوشنما کر دی گئی ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک آیت میں اس کا استعمال بھی ہے کہ یہ زینت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ خود انہیں کے نفس نے دی۔ اور فصحائے عرب کہتے ہیں اس شخص کے لیے جو ان سے دور ہو جائے کہ کہتے ہیں این ذھب یات۔ اور مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کوئی لے جانے والا اسے لے گیا بلکہ وہ خود دور ہوتا ہے۔ یہی مضمون اکثر آیات میں آیا ہے اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ ۔ اَنّٰی یُصْرَفُوْنَ شیطان کی بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ کوئی کام انسان سے جبراً کرائے پس یہ انسان

ہی ہے جو اپنے نفس کے دھوکے میں آکر اسی زندگی کو حسین سمجھتا ہے جو وہ بسر کر رہا ہے۔

اُمّۃً واحدۃ

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) لوگ ایک ہی امت تھے۔

ابو مسلم اور قاضی جبائی کا قول ہے کہ لوگ اپنی عقل کو راہنما بنا کر امتِ واحدہ کی حیثیت رکھتے تھے اور در اصل یہ اللہ اور اس کی صفات کا اعتراف تھا۔ اس کے احسانات کا شکر ادا کرنے، اس کی عبادت میں کوشاں رہنے، بُرائی سے بچنے، ظلم، جھوٹ اور جہالت جیسی چیزوں سے اجتناب کرنے میں یہی راز تھا کہ عقلی لحاظ سے ساری نسل انسانی ایک طرح سے سوچتی تھی۔ اس کے بعد یہ الفاظ ہیں فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ ۔ (پس اللہ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا) یہاں ف کا حرف تراخی کے لیے ہے پس اس آیت سے ثابت ہے کہ نسل انسانی پہلے موجود تھی اور بعد میں انبیاء کی بعثت شروع ہوئی۔ اور تمام شریعتوں سے پہلے نسل انسانی کی وحدت موجود تھی۔ بعد میں اختلافات رونما ہوئے۔

پس ظاہر ہے کہ نسل انسانی ابتدا میں ایک امت واحدہ تھی "کانوا علی شریعة من الحق" (ابن جریر عن ابن عباسؓ) "کَانُوْا عَلَی الْھُدٰی جَمِیْعًا" (ابن جریر عن قتادہ) جیسا کہ بیان کیا گیا ف تراخی کے لیے آئی ہے، یعنی اس حالت کے بہت عرصہ بعد جب اختلافات پیدا ہو گئے اور نسل انسانی متفرق ہو گئی تو ان بکھرے دانوں کو پھر ایک وحدت میں پرونے کے لیے انبیاء کا سلسلہ جاری ہوا۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے تو حضرت آدم پیدا ہوئے جو خود نبی تھے پس یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ پہلے انسان موجود تھے بعد میں انبیاء پیدا ہوئے تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسانِ اول یعنی آدم علیہ السلام مع اپنی اولاد کے پہلے پہل عقلی شریعت سے استفادہ کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بہت عرصہ بعد انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا اور اپنی اولاد کی طرف مبعوث کیا۔

حُرمت کے مہینے

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۲/۲۱۷)

اور آپ سے حرمت والے مہینوں میں قتال کے متعلق دریافت کرتے ہیں فرما دیجیے کہ ان میں قتال بہت سخت گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام ۔

فراء اور ابو مسلم کے نزدیک مسجد حرام کا عطف شہر حرام پر ہے اور اس کی ترتیب یوں ہے۔ یسئلونک عن قتال فی شھر الحرام والمسجد الحرام۔ یعنی تجھ سے حرمت کے مہینوں اور مسجد حرام میں قتال کے متعلق پوچھتے ہیں۔

اس کے بعد دو طریقے ہو سکتے ہیں یا تو قتال فیہ مبتدا ہے اور کبیر، و صد عن سبیل اللہ اور کفر بہٖ متواتر خبریں ہیں۔ پھر مفہوم یہ ہوگا کہ ایسا قتال گناہ کبیرہ ہے اللہ کی راہ سے روکنا ہے اور اللہ کے ساتھ کفر ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ "قتال فیہ کبیر" کو مبتدا اور خبر مانا جائے اور صد عن سبیل اللہ مبتدا کے ساتھ مرفوع تسلیم کیا جائے اور اسی طریقہ سے کفر بہٖ اور خبر محذوف مقدم پھر دلالت کے لیے ہے۔ اور اس کی ترتیب یوں ہے۔ قتالٌ فیہِ و صدٌ عن سبیل اللہ و کفرٌ بہٖ کبیرٌ۔ کہ اس میں قتال اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا (یعنی اس حکم کا) کبیرہ گناہ ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَ صدٌ عن سے لے کر اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ تک ایک ہی آیت تسلیم کی جائے، پھر معانی یوں ہوں گے "شہر حرام میں قتال بڑا گناہ ہے مگر اس سے کہیں بڑے گناہ یہ ہیں اللہ کی راہ سے روکنا، اس کا انکار کرنا، مسجد حرام سے روکنا اور اس سے رہنے والوں کا نکالنا۔

انفاق فی سبیل اللہ

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ — آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں

قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) — کہہ دیجیے کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

ابومسلم کے نزدیک عفو سے مراد زکوٰۃ ہے۔ یہاں اس کا اجمالی ذکر ہے اور اس کی تفاصیل سنت میں مذکور ہیں۔

تُخَالِطُوْھُمْ کے معنی

وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْیَتٰمٰی قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَیْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُکُمْ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (۲/۲۲۰)

اور آپ سے یتیموں کے متعلق دریافت کرتے ہیں فرما دیجیے کہ ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا بہتر ہے اور اگر تم ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ تو وہ تمہارے بھائی ہیں اللہ کو علم ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون۔

ابومسلم کے نزدیک خلط سے مراد نکاح میں قربت ہے جس طرح دوسری آیت میں ہے
وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا۔ ایک اور آیت میں ہے:۔
وَیَسْتَفْتُوْنَکَ فِی النِّسَآءِ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِیْھِنَّ وَمَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ۔

متذکرہ آیات اور اس آیت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں یتیم لڑکیوں کا ذکر ہے اور اس میں یتیم لڑکوں کا۔ اور اس آیت میں بعض لوگوں نے خلط سے مراد شرکت فی المال لی ہے لیکن یہ غلط ہے کیونکہ خلط کا مفہوم ذاتی طور پر یتیم سے شرکت ہے اور مالی شرکت کے لیے خلط نہیں شرکت کا لفظ موزون تھا۔

مُشرک عورتوں سے نکاح

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ۔ (۲/۲۲۱)

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔

ابومسلم کے نزدیک یہ یتیموں والی آیت سے مربوط ہے اس لیے اس پر عطف آیا ہے اس آیت میں آگے چل کر بیان کیا کہ مشرک مردوں سے نکاح بھی ممنوع ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی دولتمند کیوں نہ ہوں۔ تو ان آیات میں یتیم لڑکوں کو اپنی بیٹیاں نکاح میں دینے کی ترغیب ہے۔

توبہ کا مفہوم

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (۲/۲۲۲)

بے شک اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ لغت میں توبہ کے معنی لوٹنے کے ہیں اور بندے کا اللہ کی طرف لوٹنا ہر حالت میں اچھا ہے۔

اللہ کو قسموں کا نشانہ نہ بناؤ

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ (۲/۲۲۴)

اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔

امام رازی کہتے ہیں کہ اس آیت کے متعلق ابومسلم کا قول سب سے اچھا ہے کہ اس میں لوگوں کو بار بار اللہ کی قسم کھانے سے منع کیا ہے۔ کیونکہ کسی چیز کا بار بار ذکر کرنا ایسا ہوتا ہے جیسے اسے نشانہ بنا دیا گیا۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ قد جعلتنی عرضۃ للوم (تو نے مجھے اپنی ملامتوں کا نشانہ بنا لیا ہے)۔ ایک شاعر کا قول ہے:۔

ع - ولا تجعلنی عُرضۃ للوائم

مجھے اپنی ملامتوں کا نشانہ نہ بناؤ۔

اسی طرح اللہ نے بھی بار بار قسم کھانے سے منع فرمایا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (زیادہ قسمیں کھانے والوں کی اطاعت نہ کرو)۔ ایک اور جگہ ہے: وَاحْفَظُوْا اَيْمَانَكُمْ (قسموں کی حفاظت کرو)۔ اور عرب کسی کی مدح کرتے تو یہ بھی ایک صفت شمار کی جاتی کہ وہ بہت کم قسمیں کھاتا ہے۔ کما قال کثیر ؎

قلیل الالایا حافظ لیمینہ

وان سبقت منہ الالیہ برت

(اس میں غصہ کی تلخی کم ہے وہ قسموں کی حفاظت کرتا ہے یعنی کم قسمیں کھاتا ہے اور اگر اس سے کوئی خطا سرزد ہوتی ہے تو اس سے برأت کا اظہار کرتا ہے۔)

اور اس حکم کی ایک اور علت یہ ہے کہ جو آدمی ہر چھوٹی بڑی بات پر قسم کھاتا ہے اُس کی زبان چلنے لگتی ہے اور اُس کے دل میں قسم کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ چھوٹی قسموں میں اُس سے اعتبار اُٹھ جاتا ہے تو بڑی قسموں میں بھی اُسے معتبر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے بعد ہے اَنْ تَبَرُّوْا یہ الفاظ اُسی حکم کی علت ظاہر کرتے ہیں کہ جب اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ گے تو تقویٰ کی صفت فروغ پائے گی۔ کیونکہ دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ اللہ کی ذات بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور دنیا کی گھٹیا چیزوں میں اس کا نام لینا مناسب نہیں تو ایسے شخص میں تقویٰ کی صفات بڑھیں گی اور لوگوں کو اس پر اعتماد ہوگا اور وہ اپنے اس اعتماد کی بدولت لوگوں کی اصلاح کر سکے گا اور اُن کے جھگڑوں کو مٹا کر صلح کرائے گا۔

مطلقہ عورت پہلے خاوند سے کب نکاح کر سکتی ہے

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ پھر اگر کوئی اپنی عورت کو طلاق دے تو وہ

مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۚ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ۔ (۲/۲۳۰)

عورت اُس کے لیے اس کے بعد جائز نہ رہے گی حتیٰ کہ وہ کسی اَور مرد سے نکاح نہ کرے پھر اگر وہ بھی اسے طلاق دے دے تو دونوں کے لیے کوئی گناہ نہیں پھر مل جائیں

اسی آیت سے بعض حضرات نے حلالہ کی رسم ایجاد کر لی، کہ اگر کوئی طلاق دے کر پشیمان ہوتا ہے تو ایک رات کے لیے کسی اَور سے نکاح کر دیتے ہیں پھر وہ طلاق دیدیتا ہے اور تب عورت کا اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر دیا جاتا ہے۔ فاروقِ اعظمؓ نے اس حیلہ کو زنا کا مترادف قرار دیا ہے۔

حَتّٰى تَنْكِحَ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے خاوند سے صرف نکاح ہی کافی ہے یا خلوتِ صحیحہ بھی ہونی چاہیے؟ مفسرین متفق ہیں کہ خلوتِ صحیحہ ضروری ہے اختلاف اس امر میں ہے کہ یہ چیز قرآن سے ثابت ہے یا حدیث سے۔ امام ابن جریر لکھتے ہیں الدلالة علیٰ ذالك اجماع الامة جمیعًا (اس پر دلیل اجماعِ اُمت ہے)۔ لیکن ابو مسلم کہتے ہیں کہ شرط قرآن حکیم سے ہی ثابت ہے کیونکہ نکاح کا لفظ جب مطلق صورت میں آئے تو اس سے مراد عقدِ زوجیت ہے لیکن جب اضافت زوجۃ و امرأۃ کے ساتھ ہوگی تو ہم بستری مراد ہوگی اور یہی جمہور مجتہدین کا مذہب ہے۔ اختلاف صرف سعید بن جبیر اور سعید بن المسیب سے منقول ہے لیکن مذہب جمہور نہایت قوی اور قرآن کے عین مطابق ہے۔

امام رازی نے ابو مسلم کا قول نقل کر کے لکھا ہے ھٰذا ھو المختار (قولِ مختار یہی ہے۔)

وارث کی ذمّہ داری

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى

نہ کسی ماں کو تکلیف پہنچائی جائے اس کے بچہ کے باعث نہ کسی باپ کو اُس کے بچہ کے

اَلْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ (۲/۲۳۳) باعث اور یہی وارث کے ذمہ بھی ہے۔

ابن عباس کے نزدیک وارث سے مراد باپ کا وارث ہے۔ ابومسلم کے نزدیک یہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ اس سے اگر باپ کا وارث مراد لیا جائے تو اس کا بیٹا بھی وارث ہوتا ہے تو نفقہ کا وجوب مال کی موجودگی میں دوسرے پر لازم آتا ہے اور یہ جائز نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اگر بچہ مال کا مالک نہ ہو تو اس کے مال دار عزیزوں میں سے جو اس کے محرم ہوں اور محرم ہونے کے علاوہ شرعاً اس کے مستحق میراث بھی ہیں پس ایسے محروم وراثت قرابت داروں کے ذمہ اس کا خرچ واجب ہوگا۔ یہ قول حسن، قتادہ، قاضی اور ابومسلم کا ہے۔ اسی سے فقہائے حنفیہ و حنبلیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ محتاجوں اور نابالغوں کے مصارف ان کے اقارب کے ذمہ ہیں۔ فاروقِ اعظم کا بھی یہی قول ہے۔

من ذهب من الحنفية والحنبلية الى وجوب نفقة الاقارب بعضهم على بعض وهو مروى عن عمر بن الخطاب وجمهور السلف (ابن کثیر)

بچے کا دودھ چھڑانا

فَاِنْ اَرَادَ فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (۲/۲۳۳) پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔

ابومسلم کے نزدیک فصال سے ماں بیٹے کی علیحدگی مراد ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ باپ ماں سے مشورہ لے تاکہ بچے کا ضرر مقصود نہ ہو، گویا باہمی مشورہ سے مدت رضاعت سے کم میں بھی دودھ چھڑایا جاسکتا ہے۔

مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ کا صحیح مطلب

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم ان بیویوں کو طلاق دو

النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ (۲/۲۳۶) جنہیں تم نے ہاتھ نہیں لگایا۔

ابومسلم کا خیال ہے کہ مَس سے مراد جماع ہے لیکن اللہ نے حدودِ اخلاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے احسن الفاظ میں اشارۃً بیان فرمایا ہے

مُحسن مومن کو کہتے ہیں

حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (۲/۲۳۶) واجب ہے مُحسنین پر۔

ابومسلم کے نزدیک اِس سے مراد یہ ہے کہ جو کوئی مُحسن بننا چاہے تو اُس کی یہ شان اور یہ طریقہ ہے۔ اور محسن مومن ہی ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ حسنِ عمل کا ذکر کیا گیا ہے وہ مومنین کا طریقہ ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ کا پچھلی آیت سے ربط

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲/۲۵۳) ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے۔

دوسرے پارہ کی آخری آیت یہ تھی تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ ابومسلم نے ان دونوں آیتوں میں ربط بیان کیا ہے۔ پہلے اللہ نے سرورِ کائنات کو پچھلے انبیاء اور اُن کی قوموں کے متعلق بتایا جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا سوال بتایا کہ وہ کہتے تھے "اے اللہ ہم کو کسی شکل میں دیدار کرا دے"۔ یا موسیٰ علیہ السلام سے اُن کی یہ درخواست کہ وہ کہتے تھے "اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی بُت مقرر کر دے"۔ یا جیسا عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کا طرزِ عمل کو جب اُنہوں نے دیکھا کہ عیسیٰ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جذامیوں کو صحت یاب کرتے ہیں تو اُنہوں نے آپ کو جھٹلایا اور آپ کے قتل کے درپے ہوئے اور بعض یہودیوں نے آپ پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اور ایک فریق نے آپ کی دوستی کا دعویٰ کیا اور

یہود سے آپ کے مصلوب ہونے کا بدلہ لینے کا مطالبہ کیا اور بنی اسرائیل کے سرداروں کا حال بیان ہوا جنہوں نے حضرت طالوت سے حسد کیا اور اُن کی بادشاہی کے منکر ہو گئے اور اللہ نے حضرت طالوت کو کامیابی عطا فرمائی۔ اس آیت میں بیان فرمایا کہ کچھ وہ پیغمبر بھی گزرے ہیں جن کے ساتھ اللہ نے کلام کیا اور باقی انبیاء کو بلند درجات عطا فرمائے۔ ان کی قوموں نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی انبیاء کے ساتھ وہی سلوک کیا جو آج رسولِ عربی صلعم سے ہو رہا ہے پس گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ حضورؐ کو اپنی قوم کے طرزِ عمل سے مغموم نہیں ہونا چاہیے کیونکہ نور اور ظلمت اور حق اور باطل میں ازل سے جنگ چلی آتی ہے۔

رُوح القُدس

وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۲/۲۵۳) اور ہم نے عیسیٰؑ کی تائید روح القدس سے کی۔

ابو مسلم کے نزدیک جائز ہے کہ اس سے وہ پاکیزہ روح مراد لی جائے جو اللہ نے اُن میں پھونکی تھی۔ (یعنی خود عیسیٰ علیہ السلام کی روح) جس کے ساتھ اللہ نے دوسروں سے امتیاز کر دیا جو مرد و عورت کے ملاپ سے پیدا ہوئے تھے۔

اللہ کی ذات زمان و مکان کی قید سے پاک ہے

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ (۲/۲۵۵) اُسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

لَهٗ کو مقدم کرنے سے معنوں میں زور اور تاکید پیدا کرنا مقصود تھا، اِس لیے حصر کا مفہوم آگیا کہ ساری کائنات کی ملکیت اور مالکیت صرف اُسی کی ہے۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ مکان اللہ کی ملکیت ہے۔ دوسری جگہ ارشادِ باری ہے وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

اور یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ زمان بھی اُسی کی ملکیت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند اور پاک ہے کہ کسی مکان سے اُس کی بزرگی بیان کی جائے، یہ اللہ کی عظمت اور شان کے منافی ہے کہ اُسے کسی جہت اور مکان سے مقید مانا جائے یا اُس کی مقدار یا حجم بیان کیا جائے (نعوذ باللہ) ابو مسلم کے یہ اقوال نقل کرتے ہوئے بے ساختہ امام رازی کہہ اُٹھتے ہیں وَ ما احسن ما قال ابو مسلم بن بحر الاصفہانی۔

کُرسی

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲/۲۵۵) — اُس کا علم زمین و آسمان کو محیط ہے۔

کرسی سے مراد علم ہے۔ کیونکہ علم امر معتمد علیہ کو کہتے ہیں اور کرسی بھی معتمد علیہ ہے۔ اور لغت میں بھی کرسی سے مراد علم ہے۔ علماء کو کراسی بھی کہتے ہیں اور اوتاد الارض بھی۔

جبر و قدر

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) — دین میں کوئی جبر نہیں۔

ابو مسلم اور قفال کا قول معتزلہ کے اصولوں کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایمان کی بنیاد جبر پر نہیں بلکہ اختیار پر رکھی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل واضح طور پر بیان کر دیے اور کسی عذر کی گنجائش نہ چھوڑی تو اس کی ضرورت باقی نہ رہی کہ کفار کو ایمان لانے پر مجبور کیا جائے۔ حق اور ضلالت کی راہیں واضح ہو چکیں اب ہر ایک کو اختیار ہے کہ چاہے تو حق کا راستہ اختیار کرے اور چاہے تو ضلالت کی تاریک راہوں پر بھٹکتا رہے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ (الآیۃ)

رب چاہتا تو تمام لوگ مسلمان ہو جاتے۔ کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں
آیت لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے معاً بعد قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ
(حق ضلالت سے ممیز ہو چکا) کی آیت آتی ہے جو اس مفہوم کی تائید کرتی ہے کہ اللہ کسی کو
ایک خاص راہ پر چلانے کے لیے مجبور نہیں کرتا وہ تو محض صداقت اور بطالت کی راہیں
دکھا دیتا ہے۔

ابراہیمؑ اور چار پرندے

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا (۲/۲۶۰)

اور جس وقت ابراہیم نے عرض کی اے میرے پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو مُردوں کو کس طرح جلائے گا۔ ارشاد ہوا کیا تمہیں یقین نہیں عرض کی ضرور ہے لیکن یہ درخواست اس لیے ہے کہ قلب کو اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ ارشاد ہوا کہ اچھا چار پرندے لو پھر انہیں اپنے سے ہلا لو پھر ان میں سے ایک ایک جزو کو پہاڑ پر رکھ دو پھر اُن کو اپنی طرف بلاؤ تو وہ دوڑتے ہوئے آئیں گے۔

جمہور مفسرین اس چیز کے قائل ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ چار پرندے لے کر انہیں ذبح کریں پھر اُن کا گوشت آپس میں ملا کر پہاڑوں پر رکھ دیں اور پھر انہیں پکاریں تو وہ زندہ ہو کر آ جائیں گے۔ لیکن ابو مسلم اصفہانی کی رائے اُن کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں،
"ابراہیم علیہ السلام نے مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے متعلق سوال کیا ہے اگر پرندوں کو مار کر زندہ کرنا ہی مقصود ہوتا تو ایک پرندہ کو مار کر زندہ کر دینا کافی تھا، چار کو لے کر انہیں ذبح کرنے اور پھر گوشت کے اجزا باہم ملا دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اصل میں صُرْهُنَّ اِلَيْكَ کے معنی ہلانے

اور سکھانے کے ہیں۔ اب مفہوم یہ ہوا کہ ابراہیمؑ چاروں پرندوں کو ہلالیں اور پھر اُن میں سے ہر ایک کو قریب کے پہاڑوں پر چھوڑ دیں پھر اُن کو بلائیں تو وہ بھاگتے آئیں گے۔ اور اس محسوس مثال کے ذکر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے بلانے پر روحیں دوڑتی آئیں گی۔ اس تفسیر کی ابو مسلم نے چند وجوہات بیان کی ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ صُرْهُنَّ کے معنی ہلانے اور سکھلانے کے ہیں۔ علاوہ ازیں آیت میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جس سے ذبح کرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا مفہوم لیا جا سکے۔ اپنی طرف سے کچھ الفاظ داخل کرنا جن کا کوئی قرینہ بھی نہ ہو قطعاً ناجائز ہے۔

دوسرے اگر صُرْهُنَّ کی شاذ قرأت صِرْهُنَّ بھی مان لی جائے، اور اس کا مفہوم قطع کرنا لیا جائے تو اِلَیْكَ کے کیا معنی ہوں گے، ظاہر ہے کہ الیک یہاں قطعاً بے معنی ہوتا اور آیت بھی یوں ہوتی فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ حق یہ ہے کہ صُرْهُنَّ کا مفہوم ہلانا ہے اور جب اِلٰی بھی اس کے ساتھ آگیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنا مفہوم واضح کر دیا۔ کیا کوئی یہ دکھا سکتا ہے کہ صُرْهُنَّ کے ساتھ اِلٰی کا صلہ آئے اور پھر اس کا مفہوم کاٹنا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اُدْعُهُنَّ صاف پرندوں کی طرف راجع ہے۔ ظاہر ہے کہ پرندے زندہ ہوں گے، کیونکہ اگر گوشت کے ٹکڑوں کو بلانا مقصود ہوتا تو ضمیر انہیں کی طرف راجع ہوتی۔ اگر بعض اجزا بھاگ کر بعض کے پاس آتے تو یَاْتِیْنَكَ کی ضمیر اجزا کی طرف ہوتی۔ مگر وہ پرندوں کی طرف ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر "جُزْءً"، کا لفظ نہیں آنا چاہیے تھا، تو یہ بھی کوئی وقیع سوال نہیں کیونکہ جُزْءً کی ضمیر اضافت چاروں کی طرف کی ہے اس لیے ضروری ہے کہ جُزْءً سے مراد ان چاروں میں سے ایک پرندہ ہو۔

الحکمۃ

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ

اور جسے حکمت عطا ہو گئی اُسے یقیناً خیر کثیر

أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (۲/۲۶۹) عطا ہو گئی۔

ابومسلم کے نزدیک حکمت حکم سے فعل ہے جیسے نخلۃ، نخل سے ہے۔ ایک آدمی حکیم اس وقت کہلاتا ہے جب انتہا درجے کا عقلمند ہو۔ اور اصابتِ رائے اور سلامتیِ فکر رکھتا ہو۔ یہاں یہ لفظ حکیم، فاعل کے معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ اور یہی حکیم بروزن فعیل مفعول کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسے أَمْرٌ حَكِيْمٌ امر محکم کے معنوں میں آتا ہے۔

سورۂ آلِ عمران

بِالحق سے مراد

نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ۔ (۳/۳) اللہ تعالیٰ نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی۔

ابو مسلم کے نزدیک بالحق سے بہت سی وجوہات کا احتمال ہے (اولاً) اس میں گزشتہ امتوں کے جو حالات مذکور ہیں وہ تمام صحیح ہیں (ثانیاً) اس میں جو ترغیب و ترہیب اور وعد و وعید ہیں وہ مکلف کو حق کے رستہ پر چلنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ (ثالثاً) کتاب اللہ حق ہے قول فیصل ہے اور ہزل گوئی نہیں۔

قرآن پہلی کتابوں کا مُصدِّق ہے

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ (۳/۳) قرآن اُن کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلے آچکی ہیں۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ تمام انبیا دنیا میں حق و صداقت کی دعوت دیتے آئے تھے اور عدل، احسان، توحید اور ایمان کی تلقین کرتے رہے قرآن اُن تمام کی تصدیق کرتا ہے۔

محکمات و متشابہات

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وہی خدا ہے جس نے آپ پر کتاب اُتاری ہے اس میں محکم آیتیں ہیں اور وہی کتاب کا اصل

وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ (۳/۱)

مدار ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ سو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے متشابہ حصے کے پیچھے ہو لیتے ہیں شورش کی تلاش میں اور اس کے (غلط) مطلب کی تلاش میں۔ حالانکہ اس کا صحیح مطلب کوئی نہیں جانتا بجز اللہ کے اور پختہ علم والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر ایمان لائے یہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔

ابو مسلم فرماتے ہیں الزیغ، دل کی وہ کجی ہے جس کے باعث فتنہ پسند لوگ متشابہات کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور محکمات کے مطابق اُن کی تاویل نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر "وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا" اس آیت سے وہ یہ مطلب نکالتے ہیں کہ اللہ خود ہی کسی بستی کو بلا وجہ تباہ کر دیتا ہے اور مترفین خود خدا کے حکم سے گمراہ ہوتے ہیں۔ یہ اور ایسی بہت سی آیات ہیں جن کا صحیح مفہوم اُسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب دوسری آیات کو سامنے رکھا جائے۔ ایسی آیت کو لیجیے اس کے ساتھ اگر زائغین "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ" - "وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى" وغیرہ کو بھی سامنے رکھ لیتے تو مطلب صاف تھا، مگر دلوں کی کجی ہے جو آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے اور صاف چیز کے قائل ہو جاتے ہیں۔ پس ایسی آیات متشابہات ہیں جن کا صحیح مطلب دوسری آیات پر مدار رکھتا ہو اور یہ چیز راسخون فی العلم کو حاصل ہے۔

دُعا

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (۳/۱)

اے پروردگار سیدھی راہ دکھانے کے بعد ہمارے دلوں کو کج نہ کر۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دلوں کو ٹیڑھا نہیں کرتا پس یہ تو محض ایک دعا ہے جس کے معنی ہیں

اے ہمارے پروردگار ہمیں یہ توفیق عطا فرما کہ نفس کے فریب سے بچیں تاکہ دلوں میں کوئی کجی پیدا نہ ہو جائے۔

خیلِ مسوّمہ

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَ الْبَنِينَ وَ الْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْأَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ۭ (۳/۱۳)

لوگوں کے لیے خوشنما کر دی گئی ہے مرغوبات کی محبت خواہ عورتوں سے ہو یا بیٹوں سے یا ڈھیر لگے سونے اور چاندی سے یا نشانی پڑے گھوڑوں سے یا مویشیوں سے یا زراعت سے۔ (۳/۱۳)

ابو مسلم کے نزدیک مسومہ السیماء سے ماخوذ ہے اور السیماء کے ساتھ بھی ہے اور دونوں کے معنی ایک ہیں اور یہ حسن و جمال کا نشان ہے۔ کتاب اللہ میں سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (ان کے ماتھوں پر سجدوں کے حسین و جمیل نشانات ہیں) یہ قول ابو مسلم، اصم، قتادہ اور مورج کا ہے۔ پھر اس نشان کے تعین میں اختلاف ہے۔ ابو مسلم کے نزدیک سفید نشانوں والے گھوڑے ہیں، اصم کے نزدیک بلقی گھوڑے، قتادہ کے نزدیک چیکبرے اور مورج کے نزدیک الکی گھوڑے ہیں۔ امام رازی کہتے ہیں کہ اس بارے میں ابو مسلم کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ آیت عمدہ اموال کی طرف اشارہ کرتی ہے اور حسین گھوڑا سفید نشانوں والا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں نے جو صفات بیان کی ہیں ان سے گھوڑے کی عظمت ظاہر نہیں ہوتی۔

حجّت بازی

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ (۳/۱۹)

پس اگر وہ آپ سے حجت بازی کیے جائیں تو کہہ دیجیے میں تو اپنا رخ اللہ کی طرف کر چکا ہوں اور میرے متبعین بھی

ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ ہی بت پرست تھے مگر ابراہیمؑ کی عظمت کا اقرار کرتے تھے اور انہیں حق پرست بھی مانتے تھے، یہاں یہ کہا گیا کہ اگر وہ ابراہیمؑ کو مانتے ہیں تو ان ہی کی طرح کہیں اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ، (میں نے اللہ کے سوا تمام معبودوں سے منہ موڑ لیا اور صرف اُسی کی عبادت کا قصد کیا میں اُسی کا مخلص بندہ ہوں اور مشرکین میں سے نہیں)۔ پس آیت کی تفسیر یہ ہوئی کہ اے رسولِ خدا اگر یہود اور نصاریٰ زیادہ حجت بازی اور جھگڑا کریں تو انہیں کہہ دیجیے کہ میں اور میرے متبعین تو ابراہیم علیہ السلام کی طرح جھوٹے معبودوں سے منہ موڑ چکے تم بھی تو ایسا کر دکھاؤ۔

تحذیر

یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (۲/۲۹) اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اپنی پُرعظمت اور صاحب اقتدار ذات سے تمہیں ڈراتا ہے نفس کے ذکر کرنے سے یہ فائدہ ہے کہ اُس کی باجبروت ذات کا تصور آ جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جو عقاب اس کی طرف سے ہوگا وہ بڑا عقاب ہوگا کیونکہ وہ قوت و طاقت کا منبع ہے اور جب وہ کسی کو سزا دینا چاہے تو کائنات میں کوئی ایسی طاقت نہیں جو اُسے اس ارادہ سے باز رکھ سکے۔

ذکریاؑ

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا (۳/۴)

ذکریاؑ نے عرض کیا اے پروردگار میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے ارشاد ہوا کہ نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے بات نہ کرے تین دن تک سوائے اشاروں کے)

ابو مسلم کے نزدیک اس کے یہ معنی ہیں کہ جب ذکریا علیہ السّلام نے اللہ سے معجزہ مانگا تو اللہ نے حکم دیا کہ تین روز تک لوگوں سے باتیں نہ کرو صرف اشارات سے مطلوبہ چیزیں مانگ لیا کرو۔ اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مصروف رہو تین دن کے بعد مطلب حاصل ہو گا۔

مریم کی سرپرستی

اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ (۳/۴۴)

جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی سرپرستی کرے۔

ابو مسلم کے نزدیک پہلی اُمتیں تنازعہ کے وقت تیروں پر نام لکھ کر پھینکتی تھیں اور جس کے حصے میں وہ آتا معاملہ اُس کے سپرد کیا جاتا جیسے ایک اور آیت ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ تو یہ طریقہ بھی قداح کے طریقہ کے مشابہ تھا جس کے ذریعہ اہل عرب اونٹوں کا گوشت تقسیم کرتے تھے۔ تیروں کو اقلام اس لیے کہا گیا کہ وہ گھڑے جاتے تھے اور صاف کیے جاتے تھے ہر وہ چیز جو تھوڑی تھوڑی کاٹی جائے اس کو "قلمة" یعنی قلم کرنا کہتے ہیں۔ قلم کو بھی اسی لیے قلم کہتے ہیں کہ اُسے تراشا جاتا ہے۔

عیسےٰ پنگھوڑے میں

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا۔ (۳/۴۵)

اور وہ لوگوں سے گفت گو کریں گے گہوارہ میں اور پختہ عمر میں بھی۔

عام مفسرین کا خیال ترجمہ سے ظاہر ہے مگر اس کی لغویت بھی واضح ہے کیونکہ پنگھوڑے میں کلام کرنا تو ایک طرح سے معجزہ ٹھیرایا جا سکتا ہے لیکن پختہ عمر میں تو ہر آدمی کلام کرتا ہے اس میں خصوصیت کیا ہوئی۔ ابو مسلم کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السّلام پنگھوڑے میں بھی ایسی پختہ اور دانشورانہ باتیں کرتے تھے جیسی پختگی عمر میں کی جاتی ہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام مثیلِ آدم علیہ السلام

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ
خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ
فَیَکُوْنُ ۝ (۳/۵۸)

بے شک عیسیٰ علیہ السلام کا حال اللہ کے نزدیک آدم جیسا ہے اللہ نے اُنہیں خاک سے بنایا پھر حکم دیا وجود میں آجاؤ چنانچہ وہ وجود میں آگئے۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ خلق کے معانی تقدیر اور تسویہ کے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کی کیفیت اور اُس کے وقوع کو بھی جانتا ہے اور یہ سب صفات ازلی و ابدی ہیں تاہم کُن کا قول روح کے دخول سے عبارت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تخلیق آدم پہلے ہوئی اور بعد میں کُن کا لفظ کہا گیا۔

قرآن اور ولادتِ مسیح

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ
مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ (۳/۵۹)

یہ امر حق تیرے رب کی طرف سے ہے کہیں تو شبہ کرنے والوں میں نہ ہو جانا۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو عیسیٰ علیہ السلام کے جو حالات بتائے گئے ہیں صحیح یہی ہیں یہود اور نصاریٰ کی روایات بالکل بے بنیاد ہیں۔ نصاریٰ نے کہا کہ حضرت مریم نے معبود کو جنم دیا اور یہود نے حضرت مریم پر بدچلنی کا بہتان لگایا (معاذ اللہ) پس دونوں نے واقعات کو مسخ کر دیا اور حق وہی ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے۔

قصص الحق

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ (۳/۶۱) بے شک یہی سچے واقعات ہیں۔

ابو مسلم پچھلی آیت (فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ) اس آیت کو مربوط

تسلیم کرتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ یہ قصے سچے ہیں اور ہم جھوٹوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔

التباس حق و باطل

یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۳/۷)

اے اہل کتاب تم حق کی تلبیس باطل کے ساتھ کیوں کر رہے ہو۔

آیت کے مفہوم میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہود و نصاریٰ کے سرداروں نے اپنے ساتھیوں سے کہا ہو "منافقت کرو اور مسلمانوں کے ساتھ ظاہری موافقت اختیار کرلو لیکن اس شرط پر کہ اپنے دین کا رشتہ بھی ہاتھ سے نہ جانے دو تاکہ اس سے مسلمانوں کی طاقت کمزور ہو اور اُن کے اعتقاد و اعمال پر شبخون مارو پس اُن کے اعتقادات ضعیف ہو جائیں تو پھر کھلم کھلا اپنے مذہب کی طرف آجاؤ" یہ قول ابومسلم کا ہے اور اس کی تائید ان وجوہات سے بھی ہوتی ہے

اولاً جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا تو اس کے مابعد فرمایا بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ پس یہ آیت وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا الخ کے قائم مقام ہے۔

(ثانیاً) آیت وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَکُمْ کے بعد لائی گئی ہے۔ یہ دلالت کرتی ہے کہ انہیں اپنے دین کو چھوڑ کر کسی اور دین کو قبول کرنے کی ممانعت تھی، اُن کا یہ قول اٰمِنُوْا بِهٖ وَجْهَ النَّهَارِ بھی اسی منافقت پر دلالت کرتا ہے۔

میثاق الانبیاء

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَةٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ

اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جو کچھ تمہیں کتاب و حکمت کی قسم سے ملے پھر تمہارے پاس کوئی رسول اس کی تصدیق کرنے والا

لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۔

(۳/۸۱)

آئے جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اُس رسول پر ایمان لانا اور اُس کی نصرت کرنا۔ پھر فرمایا تم اقرار کرتے ہو اور یہ عہد قبول کرتے ہو؟ وہ بولے "ہم اقرار کرتے ہیں"۔ فرمایا تو گواہ رہنا میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں ۔

ابومسلم کے نزدیک انبیاء کے پردے میں اُن کی اُمتوں سے یہ میثاق لیا گیا ہے۔ انبیاء کا میثاق محض اس قدر ہے کہ وہ اپنی اُمتوں کو آنے والے نبی کے متعلق بتاتے رہیں اور یہ آنے والے نبی پیغمبر انسانیت حضور سرور کائنات ہیں۔ "رسولٌ" اگرچہ نکرہ ہے مگر ایک فرد معین کی جانب اشارہ کر رہا ہے ۔

الرسول هنا محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم في قول علی رض و ابن عباس رض واللفظ وان كان نكرة فالاشارة الى معين ۔

علی رض اور ابن عباس رض کے قول کے مطابق رسول سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لفظ اگرچہ نکرہ ہے لیکن اشارہ معین کی طرف ہے ۔

(تفسیر قرطبی)

ظاہر ہے کہ حضور ؐ کی بعثت کے وقت کوئی نبی بھی دنیا میں موجود نہ تھا اور جب انتقال ہو جائے تو انسان کسی چیز کا مکلف نہیں رہتا حالانکہ میثاق ایمان لانے اور نصرت کرنے کا لیا گیا ہے اور یہ تقاضا زندوں سے ہی کیا جا سکتا ہے پس میثاق اُمتوں سے ہی لیا گیا۔ اس کی تائید آیت کے آخری حصہ سے بھی ہوتی ہے کہ اُن سے کہا جا رہا ہے "پس اگر تم نے پیٹھ پھیری تو فاسق ہو جاؤ گے"۔ اور حق سے پیٹھ پھیرنا انبیاء کے شایانِ شان نہیں۔ نبی سے خطاب کے پردے میں پوری اُمت کو خطاب کرنے کا اصول قرآن میں عام ہے جیسے يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ ۔

انبیاء میں "فرق" کرنا

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ۔ ہم ان میں باہم کوئی "فرق" نہیں کرتے۔

(۳/۸۳)

عام مفسرین کا خیال ترجمہ سے ظاہر ہے "لَا نُفَرِّقُ"، کا وہ یہی مفہوم لیتے ہیں کہ ہم درجات کے لحاظ سے انبیاء میں فرق نہیں کریں گے۔ لیکن ابومسلم اس قول کا سختی سے انکار کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ پیغمبروں میں درجات کے لحاظ سے فرق ہے اور اس پر خود کتاب اللہ شاہد ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔) پس جب بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہوئی تو مراتب اور درجات میں فرق کرنا اور کس چیز کا نام ہے۔ اصل میں فرق کے معنی جدا کرنے کے ہیں قرآن حکیم میں ہے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (اللہ کی رسی کو مجتمع ہو کر مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں افتراق نہ ڈالو)۔ آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم انبیاء میں جدائی نہیں ڈالتے یعنی ایسا نہیں کرتے کہ کسی ایک نبی کا بھی انکار کر دیں۔ ہم تمام انبیاء کو مانتے ہیں۔

مسلم کے معنے

وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (۳/۸۳) اور ہم اسی کے مطیع ہیں۔

ابومسلم کہتا ہے کہ اپنی رضا سے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کرنے والے کو مسلم کہتے ہیں۔

تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ کا مفہوم

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ اس روز بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض

وُجُوۡهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ ابۡيَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فَفِىۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝

سیاہ ہوں گے پھر جن کے چہرے سیاہ ہونگے اُن سے کہا جائے گا کہ کیا تم ہی کافر ہوئے تھے ایمان کے بعد سو عذاب چکھو اپنے کفر کی پاداش میں۔ اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اُسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

(۳: ۱۰۵-۱۰۶)

جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے مفسرین نے "تَسۡوَدُّ" اور "اَبۡيَضَّتۡ" سے چہروں کا واقعتاً سیاہ اور سفید ہونا مراد لیا ہے، مگر ابو مسلم کو ان معانی سے اختلاف ہے اُن کے نزدیک یہ الفاظ حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جس طرح دوسری جگہ اللہ کا ارشاد ہے وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ مُّسۡفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسۡتَبۡشِرَةٌ ۝ وَوُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ عَلَيۡهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرۡهَقُهَا قَتَرَةٌ (کچھ چہرے اُس روز چمک رہے ہوں گے، ہنستے مسکراتے خوش، خوشخبری پالینے والے اور کچھ چہرے ایسے ہوں گے کہ ان پر غبار ہوگا سیاہی ان پر چھائی ہو گی)۔ اِس آیت میں "مسفرہ، ضاحکہ، اور مستبشرہ کے مقابلہ میں" غبرہ اور قترہ "کے الفاظ ہیں اِس لیے غبرہ اور قترہ کے اصلی معانی چھوڑ کر ضاحکہ اور مستبشرہ کی رعایت سے مجازی معنی لینے ہوں گے پس غبرہ اور قترہ کے معنی غمگین وحزین ہوں گے۔ اِسی طرح آیہ زیر بحث میں بھی "تَبۡيَضُّ" اور "تَسۡوَدُّ" کے مجازی معنی لیے جاویں گے۔

بیاض کے مجازی معنی فرحت و انبساط ہیں اور سواد کے مجازی معنی حسرت و غم ہیں اور یہ عام استعمال میں آتا ہے، کتاب اللہ میں اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِالۡاُنۡثٰى ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّهُوَ كَظِيۡمٌ (اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے) یعنی اُس کے چہرے پر حسرت و افسوس کے آثار نمایاں ہو جاتے

ہیں۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "لفلان عندی ید بیضاء کہ فلاں کے لیے میرے پاس مسرت وانبساط کا پیغام ہے۔

اور بعض نے بڑھاپے کے متعلق بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

یا بیاض القرون سودت وجھی — عند بیض الوجوہ سود القرون

فلعمری لاخفینک جھدی — عن عیان وعن عیان العیون

بسواد فیہ بیاض لوجھی — وسواد لوجھک الملعون

(اے میری مانگ کی سفیدی تو نے کالی مانگوں اور سفید چہروں والوں کے سامنے مجھے روسیاہ کر دیا۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم کہ میں تجھے لوگوں سے اور آنکھوں کے مشاہدے سے چھپانے کی پوری کوشش کروں گا جس میں میری سُرخروئی ہوگی اور تیرا ملعون چہرہ سیاہ ہو جائے گا)

جو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے اور اپنی مراد پالے تو اہل عرب کہتے ہیں۔ "ابیض وجھہ"۔ مبارک اور خوشخبری کے وقت کہتے ہیں "الحمد للہ بیض وجھک"۔ اور جو ناکامیوں اور نامرادیوں کا شکار ہو تو کہتے ہیں "اغبر وجھہ" ——— تو آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اُس روز مومن اپنے نیک اعمال کے باعث کامران و بامراد ہوں گے اور کفار اپنی بدکرداریوں کی بنا پر حسرتوں اور ناکامیوں کا مرقع بن جائیں گے۔

خیر الامم

کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ۔ (۳/۱۰۹)

تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے ہے۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ یہ آیت اَمَّا الَّذِیۡنَ ابۡیَضَّتۡ وُجُوۡھُھُمۡ کے تابع ہے یعنی جن لوگوں کو آخرت میں کامرانی حاصل ہوگی وہ یہی لوگ ہیں جنہیں دنیا میں بھی نسل انسانی

کے لیے چھانٹ کر انتخاب کر لیا گیا ہے۔

اللہ کا اذن

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۳/۱۴۴) — اور اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نہیں مرتا۔

ابومسلم کے نزدیک اذن سے مراد روح قبض کرنے کا حکم ہے پس اس حکم کے بغیر کسی کو موت نہیں آسکتی۔

اللہ کا وعدہ

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۳/۱۵۱) — اور بے شک اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

اللہ نے تقویٰ اور صبر کی شرط پر اُن سے نصرت کا وعدہ کیا اور جب اُنہوں نے یہ شرط پوری کر دی تو اللہ نے بھی اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

کفّار کا مرعُوب ہونا

سَنُلْقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ۔ (۳/۱۵۰) — ہم جلد ہی کفار کے دلوں میں تمہارا رُعب ڈال دیں گے۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ اللہ کی نصرت کا وعدہ صبر و استقلال اور تقویٰ و پرہیز گاری سے مشروط تھا مسلمانوں نے ذرا سی کمزوری دکھائی تو کفار کے دلوں سے اُن کی ہیبت اُٹھ گئی۔ یہ ایک ابتلا تھا تاکہ وہ توبہ کریں اور پھر اللہ کی نصرت کی شرط پوری کریں تو اللہ اسی طرح اُن کی مدد کرے گا اور کافروں کے دلوں میں اُسی طرح اُن کا رُعب موجود ہو گا۔

نبوت اور خیانت؟

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ۔ اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

(۳/۱۶۰)

جنگِ بدر کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم ہو رہا تھا تو ایک سُرخ رنگ کا جُبہ ذخیرہ سے غائب تھا کوئی آدمی کہہ بیٹھا کہ نبی صلعم نے لے لیا ہو گا۔ اگر یہ شخص منافق تھا تو اُس نے خیانت جیسی نارو صفت نبیؐ سے منسوب کی تھی اور اگر نا واقف نومسلم تھا تو اُسے شاید یہ معلوم نہ تھا کہ نبی اپنی مرضی سے اس طرح چیزیں نہیں لے لیتا کہ کسی کو علم تک نہ ہو، پس اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خیانت نبوت کی شان کے منافی ہے اور خیانت کرنے والے سے اللہ قیامت کو نپٹ لے گا۔ یہ آیت دامنِ نبوت کو آفتاب کی طرح روشن دکھا رہی ہے اور سب غلط خیالوں کی اصلاح کر رہی ہے۔

سُورۃ النِّسآء

خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا کا مفہوم

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ۔ (۴/۱)

اے لوگو اپنے اُس رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی سے اُس کا جوڑا پیدا کیا۔

اِس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے اسرائیلی روایات سے متاثر ہو کر عجوبہ پرستی کی ایک نئی عمارت کھڑی کی ہے مِنْهَا زَوْجَهَا کے الفاظ دیکھ کر تخلیقِ حوا کے متعلق عجیب و غریب حکایت بیان کی ہے کہ آدم علیہ السلام پیدائش کے بعد اکیلے زمین پر پھرتے تھے اور ہم جنس نہ پا کر بے چین رہتے تھے۔ دوسرے جمعہ کو آدم علیہ السلام سو رہے تھے کہ فرشتوں نے اُن کی بائیں پسلی چاک کی اور اُس سے حضرت حوا کو نکالا۔ یوں حوا پیدا ہو گئیں۔ یہ حکایت نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ بلکہ توریت کے قصہ کی لفظی نقل ہے۔ توریت کا بیان حسبِ ذیل ہے:

"خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اُس نے اُس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی، اور اُس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا نے اُس پسلی سے جو اُس نے آدم سے نکالی تھی ایک صورت بنا کر آدم کے پاس بھیجا"۔ (پیدائش - ۲-۲۲-۲۳)

ابو مسلم کے خیال میں وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا کے معنی ہیں من جنسها یعنی اُس کی جنس سے اُس کا جوڑا پیدا کیا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا۔ (اللہ نے تمہارے نفسوں سے (جنس سے) تمہارے جوڑے پیدا کیے)۔ ظاہر ہے کہ اگر منها سے پسلی سے نکالنا مراد تھا تو یہاں گویا تمام دنیا کے مردوں کی بیویاں اُن کی پسلیوں سے نکلیں۔ ایک اور

جگہ ارشاد ہے اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ (جب اللہ نے اُن کی جنس سے ہی رسول مبعوث فرمایا۔)

وراثت میں لڑکے اور لڑکی کا حصہ

لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (۴/۱۱) مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔

ابومسلم کے نزدیک اس آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو تہائی ہو کیونکہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور جب لڑکے کا حصہ دو تہائی ہو تو لڑکی کو ایک تہائی ملنا چاہیئے

منافق اور مصیبت کا سامنا

فَکَیْفَ اِذَا اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ (۴/۶۲) پس کیسے گزرتی ہے جب اُن پر مصیبت آپڑتی ہے۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ پہلے اللہ نے منافقوں کے حالات بتائے وہ کس طرح شیطان کی راہوں پر چل نکلے ہیں اور حضور کے احکام سے مُنہ پھیرتے ہیں۔ رسولِ اکرم کو بشارت دی کہ ان پر ایسی مصیبتیں ٹوٹنے والی ہیں کہ وہ پھر خاسر و نامراد آپ کے پاس آکر پناہ لیں گے اور اپنے مومن ہونے کا اظہار کریں گے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی صداقت کا یقین دلانے کی کوشش کریں گے پس جب یہ مصیبت اُن پر آپڑی تو کیسی گزرے گی۔ اہلِ عرب بشارت اور انذار کے وقت کہتے ہیں کیف انت اذا کان کذا و کذا۔ جب معاملہ ایسا ایسا ہو جائے تو تجھ پر کیا گزرے گی۔ قرآن میں بھی بیشتر مقامات پر یہی طرز بیان اختیار کی گئی ہے فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَھِیْدٍ (جب ہر قوم پر ہم گواہ لے آئیں گے تو پھر کیا گزرے گی)۔

ایک اور مقام پر ہے فَکَیْفَ اِذَا جَمَعْنٰھُمْ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْہِ (اور جب ہم اس روز جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، تو اُن پر کیا گزرے گی۔)

مقامِ مسرّت

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فرما دیجیے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت
فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ! پر خوشیاں مناؤ۔!

ابومسلم کے نزدیک فضل اور رحمت سے اللہ کی مدد مراد ہے، اللہ نے بیان فرمایا کہ اگر انہیں کامیابی نہ ملتی اور اللہ کی مدد حاصل نہ ہوتی تو نجانے کتنے دین سے پھر جاتے۔ صرف وہی لوگ دین پر قائم رہتے جو صاحب بصیرت اور صاحب عزم و استقلال ہوتے۔ جو یہ جانتے تھے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ حق کو اس دنیا میں حکومت حاصل ہو لیکن دلائل کی پختگی اور بار بار کی کامیابی اس کے حق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

سورۃ المائدۃ

نصیحت بھول جانے والے

وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ (۵/۱۳)

اور جو اُن کو نصیحت کی گئی تھی اُس کا ایک حصہ بھول گئے اور ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا تو اُن کی خیانت پر خبر پاتا رہے گا، سو اُن کو معاف کر اور درگزر کر۔

ابومسلم کے نزدیک اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم دیا تھا کہ ان سے درگزر فرمائیں اور جب تک وہ عہد پر کاربند رہیں اُن کی معمولی لغزشیں معاف فرمائیں قلیل سے وہ کافر مراد لیے جاسکتے ہیں جو اپنے کفر پر باقی رہے۔

نقیب کے معنی

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ (۵/۱۲)

اور ہم نے اُن میں سے بارہ سردار مقرر کیے۔

ابومسلم کے نزدیک یہاں نقیب بطور فعیل مفعول کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جس طرح قتیل مقتول کے معنوں میں آتا ہے اسی طرح نقیب منقوب کے معنوں میں ہے یعنی اُنہیں چنا گیا۔

غُراب

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا (۵/۳۱)

پس اللہ نے کوا بھیجا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں جھگڑا ہوا اور ایک بھائی نے دوسرے کو قتل کر دیا تو وہ پریشان کھڑا تھا کہ اب لاش کو کیا کرے۔ پس دو کوّے آئے ایک نے دوسرے کو مار ڈالا اور دفن کر دیا۔ اس سے اُسے بھی لاش چھپانے کا طریقہ معلوم ہو گیا۔ ابو مسلم کہتے کہ دو کوّے نہیں صرف ایک کوا بھیجا گیا تھا، چونکہ کووں کی عادت ہی چیزوں کو چھپانا ہے اس لیے اُس کوے نے کوئی چیز دفن کی جس سے قاتل نے بھی لاش چھپانا سیکھ لیا۔

رکوع

يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُونَ ۝ (۵۵)

وہ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں۔

ابو مسلم کے نزدیک رکوع سے مراد خشوع و خضوع اور عاجزی و انکساری ہے یعنی وہ صلوٰۃ قائم کرتے زکوٰۃ ادا کرتے اور اللہ کے تمام احکام کے آگے عجز و خشوع سے سر جھکا دیتے ہیں۔

سُورۃ الانعام

اجل اور اجلِ مسمیٰ

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰی اَجَلًا وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَہٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۰ (۶/۲)

وہ ذات ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر ایک میعاد ٹھیرا دی اور ایک اور میعاد اُس کے ہاں معین ہے پھر بھی تم جھگڑتے ہو۔

ابو مسلم کے نزدیک اَجَلًا سے پہلے لوگوں کی موت مراد ہے اور اَجَلٌ مُّسَمًّی سے باقی لوگوں کی موت مراد ہے۔ پچھلے لوگ تو مر گئے اِس لیے اُن کی موت کا وقت معلوم ہو گیا اور جو باقی ہیں وہ مرے نہیں اِس لیے اُن کی موت کا علم (عِنْدَہٗ) اللہ کے پاس ہے۔

زمان و مکان

وَ لَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّھَارِ (۶/۱۳)

اور اُسی کا ہے جو کچھ رات اور دن میں بستا ہے۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ اِس سے پچھلی آیت میں آسمانوں اور زمینوں کا ذکر کر کے تسلیم کرایا کہ "مکان" اللہ کی ملکیت ہے، اور اِس آیت میں شب و روز کا ذکر کر کے ثابت کیا جا رہا ہے کہ "زمان" بھی اللہ کی ملکیت میں ہے۔ زمان و مکان حادثاتِ حیات کے لیے ظرف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے خبر دی کہ وہ زمان و مکان اور اُن کے متعلقات کا خالق اور مالک ہے۔

مستقر اور مستودع

وَهُوَ الَّذِیٓ اَنۡشَاَ کُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ فَمُسۡتَقَرٌّ وَّ مُسۡتَوۡدَعٌ۔ (۹۹/۶)

اور وہی ذات ہے جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا پھر ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سونپا جانے کی۔

ابومسلم کے نزدیک اس کی ترتیب یوں ہے "ھُوَ الَّذِیٓ اَنۡشَاَ کُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ فَمِنۡکُمۡ مُسۡتَقَرٌّ ذَکَرٌ وَّ مِنۡکُمۡ مُسۡتَوۡدَعٌ اُنۡثیٰ"۔ اللہ نے مذکر کی تعبیر مستقر سے کی کیونکہ نطفہ اس کی پیٹھ میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں قرار پکڑتا ہے اور مؤنث کی تعبیر مستودع سے کی کیونکہ رحم کو گویا نطفہ سونپ دیا جاتا ہے۔

اَلنَّارُ مَثۡوٰکُمۡ

قَالَ النَّارُ مَثۡوٰکُمۡ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (۱۲۹/۶)

(وہ کہیں گے ہم اپنی میعاد کو پہنچ گئے) اللہ کہے گا آگ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں رہو گے مگر جو چاہے اللہ۔

اِس سورۃ میں اگرچہ کفار کا ذکر ہے مگر اِلَّا کی استثنار سے بعض لوگوں نے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ دوزخ میں بھی ہمیشہ کوئی نہیں رہے گا۔ ابومسلم کے نزدیک اس استثنار کا تعلق خلود سے نہیں بلکہ اس کا تعلق وَ بَلَغۡنَآ اَجَلَنَا الَّذِیۡٓ اَجَّلۡتَ لَنَا سے ہے۔ یعنی وہ کہیں گے ہم اپنی اُس مقررہ میعاد کو پہنچ گئے جو اے اللہ تو نے ہمارے لیے مقرر کر رکھی تھی، حالانکہ بعض کو تو نے وقت سے پہلے ہلاک کر دیا جیسے "اَلَمۡ یَرَوۡا کَمۡ اَهۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ" سے ظاہر ہے جیسا کہ قوم نوح اور قوم عاد و ثمود سے کیا گیا پس کلام کا خلاصہ یوں ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے کہ ہم میں سے بعض نے بعض سے سنا کہ جو کچھ ہمارے لیے مقرر کیا گیا وہ ہم تک پہنچا اور جس قوم کو تو نے چاہا وقت سے پہلے ختم کر دیا (اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ) ویسے الا ما شاء اللہ کا استثنار بالمشیت ثبوت

ثبوت اور استمرار کے لیے آتا ہے۔ اس کی تفصیل ناسخ منسوخ کے تحت آچکی ہے۔

تیسری مخلوق

اِنْ یَّشَاْ یُذْہِبْکُمْ وَیَسْتَخْلِفْ / اگر خدائے بے نیاز چاہے تو تمہیں ختم کردے

مِنْ بَعْدِکُمْ مَا یَشَآءُ ($\frac{6}{134}$) اور تمہارے بعد جن کو چاہے تمہارا جانشین بنادے۔

ابومسلم کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس طرح تمہیں جنوں کا جانشین کیا اسی طرح وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ کوئی تیسری مخلوق پیدا کرکے انسانوں کی جانشین بنا دے۔

سُورۃ الاعراف

شیطان اور آدم و حوّا

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ (۲۰) پھر شیطان نے دونوں کو وسوسہ ڈالا۔

ابوسلم فرماتے ہیں جنت سے زمین کا کوئی سا باغ مراد ہے اور آدم و حوا کے ساتھ وہیں ابلیس بھی تھا اور یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ابلیس سانپ کے پیٹ میں داخل ہوا اور پھر سانپ جنت میں داخل ہوگیا تو یہ قصہ چاہے کتنا ہی مشہور کیوں نہ ہو سراسر لغو اور باطل ہے۔

رجفہ

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ (۷۸) پس انہیں زلزلہ نے آلیا۔

بعض ملاحدہ نے ان آیات پر یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن قوم ثمود کی تباہی کو مختلف مقامات پر مختلف الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہاں بتایا گیا کہ "رجفہ" سے تباہی ہوئی کہیں اس لفظ کی بجائے "طاغیۃ" کا لفظ استعمال کیا ہے اور کہیں "صیحہ" کا۔ ابومسلم نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ "طاغیۃ" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی حدود سے تجاوز کر جائے چاہے وہ حیوان ہو یا غیر حیوان۔ "طاغیۃ" کے آخر کی ہا (ۃ) معنوں میں زیادتی پیدا کرنے کے لیے بڑھائی گئی ہے۔ اسی لیے مسلمان ظالم بادشاہ کو "طاغوت" اور "طاغیہ" کہتے ہیں۔ ارشاد باری ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى (بے شک انسان سرکشی کرتا ہے) طغیٰ سے طغیان، طاغ اور طاغیہ صیغے آتے ہیں۔ غیر حیوان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے "انا لما طغی الماءُ" اس وقت کہا جاتا ہے جب پانی غالب آجائے اور اپنی حدود سے تجاوز کر جائے۔ رجفہ سے مراد زمین کا ہلنا ہے اور یہ وہ حرکتِ زمین ہے جو عام حرکت سے مختلف ہوتی ہے۔ پس اس پر اگر طاغیہ کے لفظ کا اطلاق کیا جائے تو بلاغت سے تناقض نہیں۔ رہا "صیحہ" کا لفظ تو اس کا اطلاق ہمیشہ زلزلہ پر ہوتا ہے۔ پس ملحدین کا قول باطل ہو جاتا ہے۔

تیس۳۰ راتیں

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (۱۴۲/۷)

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا اور اس کو دس اور راتوں سے پورا کیا تب اس کے رب کی مدت چالیس رات پوری ہوئی۔

ابو مسلم نے سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے تیس روز طور پر گزارے تھے کہ اللہ نے خبر دی "سامری نے تیری قوم کو گمراہ کر دیا ہے!" اس پر وہ واپس چلے گئے اور پھر دس دن کے لیے آئے۔ اس طرح چالیس راتیں پوری ہوئیں

مُتکبّرین فی الارض

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (۱۴۶/۷)

میں اپنی آیات سے اُن لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔

کعبی اور ابو مسلم کے نزدیک یہ کلام اُس وعدہ کا پورا کرنا ہے جو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے متعلق کیا تھا پس وہ اب اس بات پر قادر نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو تبلیغ سے روکیں اور نہ مسلمانوں کو ایمان لانے سے منع کر سکتے ہیں۔ یہ آیت اسی کے مشابہ ہے وَبَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (جو کچھ آپ کے رب نے آپ کی طرف نازل کیا اس کی تبلیغ کیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو فریضۂ رسالت ادا نہ کیا اور اللہ تعالےٰ آپ کو لوگوں سے بچائے گا)۔ اللہ تعالےٰ نے ارادہ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کو ایذا دینے سے روکے اور مانعین تبلیغ کو ختم کرے۔

موسیٰ کا قوم کی طرف لوٹنا

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰی اِلٰی قَوْمِہٖ — اور جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹے

غَضْبَانَ اَسِفًا (۷/۱۵۰) — غضب ناک اور متاسف۔

ابو مسلم کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام کو آنے سے پہلے علم تھا کہ سامری نے آپ کی قوم کو گمراہ کر دیا ہے۔ خود یہی آیت اِس بات پر دلالت کرتی ہے کیونکہ وہ واپس آئے تو غضب ناک اور متاسف تھے۔ دوسرے اللہ نے اس واقعہ کا ذکر میقات میں کر دیا تھا۔

مثال

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ — اور ان پر اُس شخص کی خبر پڑھ جس کو ہم نے اپنی

اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا۔ (۷/۱۷۵) — آیات دیں پھر وہ اُنہیں چھوڑ نکلا۔

جمہور مفسرین نے اس آیت سے کوئی متعین شخص مراد لیا ہے بعض نے بلعم باعور بعض نے کوئی راہب اور بعض نے امیہ کا ذکر کیا ہے، لیکن قتادہ، عکرمہ اور ابو مسلم کا قول ہے کہ وہ کوئی متعین شخص نہ تھا یونہی ایک عام مثال پیش کی گئی ہے کہ جس آدمی نے بھی ہدایت سے مُنہ موڑا وہ شیطان کا متبع ہوا اور اسی طرح رفعتوں کو چھوڑ کر پستیوں میں چلا گیا۔ ابو مسلم کے نزدیک اٰتَیْنٰهُ کے معنی ہیں بَیَّنَّاہُ اور اِنْسَلَخَ اور عریٰ مترادف ہیں اور اس آیت کا اطلاق ہر اس کافر پر ہوتا ہے جو دلائل کے باوجود ایمان نہ لائے اور اپنے کفر پر قائم رہے۔ اُس کی مثال یہ آیت ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا۔

سورة التوبة

مشرکین اور مساجد

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ (۹/۱۸)

مشرکوں کا کام نہیں کہ اپنے اوپر کفر کی گواہی دیتے ہوئے مساجد آباد کریں۔

یعنی اِس حالت میں جب کہ وہ عملی طور پر کفر و شرک کے مرتکب ہیں تو ایسے کام اُنہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتے کیونکہ یہ فروعی نیکیاں تو اُسی کو فائدہ دیتی ہیں جو اللہ، رسول اور قیامت پر ایمان لائے، صلوٰۃ قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ کرے

امید

فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ (۹/۱۹)

سو امید ہے کہ یہ لوگ (مومن) ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آیت میں شک اور تذبذب ہے جو اللہ کے لیے جائز نہیں ابو مسلم کہتے ہیں کہ فَعَسٰى (سو امید ہے) کا تعلق بندوں سے ہے، تو معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ اعمالِ صالحہ کرتے ہیں تو صرف کامیابی کی امید پر کرتے ہیں جس طرح اس آیت سے ثابت ہوتا ہے وَيَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (اور وہ امید و بیم کے عالم میں اپنے رب کو پکارتے ہیں)۔ بندہ جب نیک اعمال کرتا ہے تو بدلہ میں اپنی فوز و فلاح کی امید رکھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مقبولیت کے حصول میں جو رکاوٹیں تھیں وہ اس نے دور کر دیں مھتدین سے مراد انعام

پانے والے اور کامیاب ہونے والے ہیں۔

کتابُ اللہ

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (۹/۳۶)

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک اُس کے حکم سے بارہ مہینے ہے۔

ابومسلم فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ سے مراد اللہ کا حکم اور اس کا قانون ہے جیسے فرمایا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ (تم پر قصاص فرض کیا گیا)۔

اِستہزار

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝ (۹/۶۴)

منافق ڈرتے ہیں کہ اُن کے متعلق کوئی سورت نہ اُتاری جائے جو اُن کے دلوں کے بھید کھول کر بیان کر دے، فرما دیجیے کہ تم استہزاء کیے جاؤ اور اللہ اس کو کھولنے والا ہے جس کا تمہیں خوف ہے۔

ابومسلم کا خیال ہے کہ اس اندیشے کا اظہار منافقین نے بطور استہزار کیا، کیونکہ حضور کہتے تھے کہ مجھ پر اللہ وحی نازل کرتا ہے تو منافقوں کا خیال تھا کہ پھر اللہ اُنہیں منافقوں کے بارے بتا کیوں نہیں دیتا دوسری طرف اُن کے دلوں میں یہ خوف بھی موجود تھا کہ کہیں سچ مچ اللہ اُنہیں خبردار نہ کر دے پس اللہ نے کہا کہ وہ ان کے بھید کھولنے والا ہے۔ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا (فرمائیے کہ استہزار کیے جاؤ) سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ اللہ نے بطور طنز فرمایا کہ نبی صلعم کو معلوم ہے کہ تم جب اپنے شیطانوں سے ملتے ہو تو کہتے ہو اذا منکم انما نحن مُستَھزِءُوْن (ہم تو تمہارے ساتھی ہیں مسلمانوں سے تو محض استہزار کرتے ہیں۔)

قبولیتِ توبہ کی بشارت

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ (۹/۱۰۴)

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں چاہے اَلَمْ کو استفہام کہو مگر اس سے مقصود خبر دینا ہے، ایسے استفہام استخباری کہتے ہیں۔ اہلِ عرب کی عادت ہے کہ مخاطب کے ازالہ شک کے لیے بھی استفہام لاتے ہیں جیسے کہتے " ما علمت یجب علیك خدمتہ" (کیا تو نہیں جانتا کہ اس کی خدمت تیرا فرض ہے)۔ یا کہا جاتا ہے " ما علمت ان من احسن الیك یجب علیك شکرہ" (کیا تو نہیں جانتا کہ جس نے تجھ پر احسان کیا اُس کا شکر یہ ادا کرنا تجھ پر لازم ہے)۔ اس آیت میں اللہ نے توبہ کرنے والوں کو توبہ کی قبولیت کی بشارت دی اور پھر بطور تاکید فرمایا کہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے

شہادت

قُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُہٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۹/۱۰۵)

فرمائیے کہ عمل کرو اللہ، رسول اور مومن تمہارا عمل دیکھ لیں گے۔

ابو مسلم کا قول ہے کہ مومن قیامت کے روز اللہ کے گواہ ہوں گے (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ ......) اور رسولِ خدا صلعم بھی گواہ ہیں (فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ اور دوسری جگہ ہے وَجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَہِیْدًا)۔

پس اس آیت سے مقصود تنبیہہ ہے کہ قیامت کے روز تمہارے اعمال سامنے آجائیں گے۔

اَلسَّآئِحُوْنَ

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ (۹/۱۱۲)

توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، سفر کرنے والے۔

ابومسلم کے نزدیک السَّآئِحُوْنَ سے سفر کرنے والے لوگ مراد ہیں اس کا مادہ السیح ہے، پانی کے جاری ہونے کو سیح الماء کہتے ہیں، یعنی جو لوگ جہاد اور ہجرت کے لیے سفر کرتے ہیں۔

ساعتِ عُسرت

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَالْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ (۹/۱۱۷)

اللہ نبی پر اور اُن مہاجرین وانصار پر مہربان ہوا جنہوں نے تنگی کی گھڑی میں اس کی اتباع کی۔

ابومسلم کہتے ہیں ساعتِ عسرت سے وہ تمام تکالیف مراد لی جاسکتی ہیں جن میں حضور، مہاجرین اور انصار مبتلا ہوئے، غزوات بھی اسی میں شمار ہوں گے اور اس سے مطلب مہاجرین وانصار کی تعریف ہے اور اُن سے زیادہ عظمت اور بزرگی کس کو نصیب ہو سکتی ہے کہ جس کی اللہ بھی مدح کرے۔

سورۂ یونس

آلر کے معنی

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿۱-۱﴾ — الر۔ یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔

ابومسلم کے نزدیک آلر سے حروف تہجی کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ وہ حروف ہیں جن کی ترتیب سے ایسی پرعظمت اور معجز نما کتاب وجود میں آئی۔ ابن عباس کے نزدیک آلر سے مراد انا اللہ اریٰ (یعنی میں اللہ دیکھ رہا ہوں)۔

استویٰ علی العرش

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴿۳-۱﴾ — پھر وہ عرش کی طرف متوجہ ہوا۔

مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ آسمانوں کے اوپر ایک بہت بڑا تخت ہے جس کو عرش کہتے ہیں، لیکن ابومسلم کہتے ہیں کہ عرش کا یہ مفہوم نہیں، اصل میں تمام تعمیر کے کام کو عروش کہتے ہیں اور بنانے والے کو عارش کہا جاتا ہے مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ اس آیت میں یعرشون کے معنی بیننون کے ہیں۔ دوسری جگہ ایک بستی کی ہلاکت و تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا اور مطلب یہ ہے کہ اس بستی میں مکان اپنی بنیادوں پر استوار ہیں چھتیں موجود ہیں لیکن رہنے والوں سے خالی ہیں۔ ایک اور جگہ فرمایا وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ یعنی اس کی بنیاد پانی پر ہے اور اس آیت کو اپنی قدرت کے اظہار کے لیے پیش فرمایا کیونکہ مکانوں کو پانی سے دور خشک زمین پر بنایا جاتا ہے اور اللہ نے زمین کو پانی پر بنایا تاکہ صاحب

عقل لوگ اس کی قدرت کو پہچانیں۔ پھر آیت کے آخر میں فرمایا گیا "کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے"۔ اس سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے کیونکہ نصیحت اُس چیز سے لی جا سکتی ہے جو آنکھوں کے سامنے ہے تو آسمانی عرش جسے ہم دیکھ بھی نہیں سکتے وہ کس طرح صانع کے وجود پر دلالت کر سکتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالٰے نے ارض و سمٰوٰت کی تخلیق کی۔ پھر اس کی سطح بنائی اور اُس کی مختلف شکلیں (جو اُس کی مصلحتوں کے مطابق تھیں) بنائیں۔ (ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ) اس آیت میں بھی یہی مفہوم بیان ہوا ہے ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا۔ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا سب سے پہلے اس کا بنانا ذکر کیا پھر اُس کو بلند کرنے کا تذکرہ کیا پھر اُس کو صحیح شکل دینے کے متعلق بیان ہوا۔ پس یہاں بھی پہلے زمین و آسمان کی تخلیق کا ذکر ہوا پھر ثُمَّ استوٰی علی العرش کے الفاظ سے یہ اشارہ کیا تخلیق کے بعد اُس کو صحیح شکل دی گئی۔

پُکار

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ (۱۰/۱۰)

اُن کی پکار یہ ہے کہ اے اللہ تو پاک ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک دَعْوٰىهُمْ سے مراد اُن کا قول و قرار اور اُن کی پکار ہے۔

سورۂ ہود

زفیر

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ — جو بدبخت ہیں تو دوزخ میں اُن کے لیے

لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ (۱۱/۱۰۶) — چیخنا اور چلانا ہوگا۔

ابومسلم کے نزدیک زفیر اُس سانس کو کہتے ہیں جو سخت رونے کی وجہ سے اٹک جائے اور شہیق اُس آواز کو کہتے ہیں جو سخت مصیبت اور دکھ کے وقت ظاہر ہوتی ہے اور کبھی اس کے بعد غشی کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور بعض اوقات موت آجاتی ہے۔

سُورَۃُ الرَّعد

مِحال کے معنی

وَهُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ۔ — اور وہ بڑی قوت والا ہے۔

(۱۳/۱۳)

ابومسلم کے نزدیک محال کے معنی سختی کے ہیں اس لیے قحط کے سال کو "سنۃ المحل" کہتے ہیں۔ محال، محل سے فِعال کے وزن پر ہے اور فعال کا وزن عام طور پر مجازاة اور مقابلہ کے لیے ہوتا ہے۔ پس معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ سخت قلبے والا ہے۔

سورۃ ابراہیمؑ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰ علیہ السلام

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ	ہم نے موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ
اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی	بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیرے سے روشنی کی طرف
النُّوْرِ (۱۴/۵)	نکال لا۔

ابو مسلم فرماتے ہیں اللہ نے حضورؐ کو قرآن حکیم عطا فرمایا تو کہا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (یہ کتاب آپ پر اتاری گئی تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں)۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (تاکہ تو اپنی قوم کو ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لائے) مطلب یہ ہے کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد واحد ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام اور سرور کائنات کے پیغام میں اتنا فرق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو صرف اپنی قوم کو نور کی طرف لانے کا حکم ہوا ہے لیکن حضورؐ کی نبوت پوری نسلِ انسانی کے لیے ہے اور ان کا پیغام پوری انسانیت کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لانے والا ہے۔

بیّنات

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ	انبیاء کھلے دلائل لے کر آئے تو انھوں نے اپنے
فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ (۱۴/۹)	ہاتھ اپنے منہ میں ڈال لیے۔

ابو مسلم کے نزدیک بیّنات سے مراد انبیاء کے دلائل ہیں کیونکہ دلائل انبیاء نسلِ انسانی کے لیے

انعامِ عظیم ہیں۔ اور انعام کے لیے ید کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے لفلان عندی یدًا (فلاں کا مجھ پر بڑا احسان ہے)۔ "ید" کے لفظ سے بیعت اور وعدہ بھی مراد لیا جاتا ہے جیسے اللہ کا ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ ...... الخ (جو لوگ تجھ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اصل میں اللہ سے بیعت کر رہے ہیں اور تیرا ہاتھ اُن پر نہیں اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر ہے۔) پس وہ دلائل جو انبیاء بیان فرماتے تھے نعائم اور احسانات تھے تھوڑی تعداد کے لیے جمع "ایدی" آتی ہے اور زیادہ تعداد کے لیے "الایادی"۔ پس انبیاء کے دلائل کو ایدی کا نام دینا زیادہ صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وعدے جو زبانوں سے کیے جاتے ہیں وہ قبول نہ ہوں تو جہاں سے آئے ادھر ہی لوٹا دیے جاتے ہیں جب قبول کی صورت ہو تو وعدے کی تکرار دوسرے منہ سے ہوتی ہے اور جب رد کرنا مقصد ہو تو جدھر سے آیا اُدھر ہی لوٹا دیا جاتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ید" کا اطلاق انگلی پر کیا جائے اور اس کا یہ مفہوم ہو کہ اُنھوں نے حیرانگی سے منہ میں انگلیاں ڈال لیں۔

ثمرات

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ۔ (۱۴/۳۲)

پھر اُس نے تمہارے لیے ثمرات سے رزق نکالا۔

ابو مسلم کے نزدیک ثمرات سے عام طور پر درختوں کے پھل مراد لیے جاتے ہیں لیکن زراعت اور نباتات کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اللہ کا ارشاد ہے كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (جب کھیتی پھل لائے تو کاٹنے کے روز اُس کا حق ادا کرو)۔

سُورۃُ الکہف

کتاب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَیِّمًا (۱۵/۱)

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری جس میں کوئی کجی نہیں۔

ابو مسلم کے نزدیک یَجْعَلْ لَّهٗ، عِوَجًا" اور قَیِّمًا" دونوں متواتر حال ہیں، اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ "اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی"۔

سُورۃُ المریم

موالی

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ (۱۹/۵)

اور میں اپنے بھائی بندوں سے اپنے پیچھے ڈرتا ہوں۔

ابو مسلم کے نزدیک موالی سے مراد مددگار چچا کا بیٹا، مالک اور صاحب ہیں اور یہاں اس سے مراد بیٹے کا قائم مقام ہے۔

رجم

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ (۱۹/۴۶)

اگر تو باز نہ آئے تو میں تجھے دھتکار دوں گا۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ لَاَرْجُمَنَّكَ کے معنی پتھروں کے سنگسار کرنے کے بھی ہیں اور یہ جلاوطن کرنے، ہانکنے اور دور بھیجنے کے معنوں میں بھی آتا ہے نکال دینے یا ہانک دینے کی تائید وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا سے بھی ہوتی ہے۔

سورۂ طٰہٰ

اَکَادُ کا صحیح مفہوم

اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا (۲۰/۱۵) وہ گھڑی ضرور آنے والی ہے میں اُسے مخفی رکھنا چاہتا ہوں۔

ابو مسلم کے نزدیک اَکَادُ سے مراد چاہنا ہے جیسے کِدْنَا لِیُوْسُفَ (ہم نے یوسف کے لیے یہی چاہا۔) عام طور پر کہتے ہیں لا افعل ذالك ولا اکاد (میں ایسا نہیں کرنا چاہتا)۔

صلوٰۃ سے روکنا

فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْھَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ (۲۰/۱۶) سو تجھے اس سے وہ شخص نہ روکے جو اس پر ایمان نہیں لاتا۔

ابو مسلم کے نزدیک یَصُدَّنَّکَ سے مراد صلوٰۃ سے روکنا ہے مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِھَا میں ھَا ضمیر قیامت کی طرف ہے۔ اور اس طرح کا استعمال لغتِ عرب میں جائز ہے کیونکہ عرب دو خبروں کو ملا دیتے ہیں اور پھر دونوں کا اکٹھا جواب دیتے ہیں اور سننے والوں کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔

قِصّۂ سامری

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ یٰسَامِرِیُّ۔ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ یَبْصُرُوْا بِہٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَۃً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ موسیٰ نے پوچھا کہ سامری تیرا کیا حال ہے؟ اس نے کہا مجھے وہ چیز دکھائی دی جو اوروں کو نہیں دکھائی دی تو میں فرشتہ کی (گھوڑی) کے نقش قدم کی مٹی سے

فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ۔ (۲۰ / ۹۵-۹۶) ایک مٹھی بھر لی پھر اُس ڈھلے ہوئے بچھڑے میں ڈال دیا اور میرے دل نے مجھ کو ایسی ہی صلاح دی۔

مفسرین نے ان آیات پر ایک عجیب قصے کی بنیاد رکھی ہے، کہتے ہیں سامری کا اصل نام موسیٰ تھا اُسے بھی فرعون کے خوف سے غار میں ڈال دیا گیا تھا، وہاں جبرائیلؑ نے اُس کی پرورش کی ایک شعر ہے اس میں پہلے موسیٰ سے مراد یہی سامری ہے اور دوسرے موسیٰ سے حضرت موسیٰؑ۔

فموسی الذی ربّاہ جبریل کافرٌ

و موسی الذی ربّاہ فرعون مرسلٌ

(ایک موسیٰ وہ تھا جسے جبریل نے پالا مگر وہ کافر ہوگیا۔ اور ایک موسیٰ وہ تھا جنہیں فرعون نے پالا وہ پیغمبر بنے)

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی تمام جماعت لے کر راتوں رات مصر سے نکل آئے، فرعون نے لشکر لے کر اُن کا پیچھا کیا۔ جاتے جاتے جب بنی اسرائیل دریا کے کنارے پہنچے تو حضرت موسیٰ کے معجزہ سے وہ پایاب ہوگیا اور سب لوگ پار اُتر گئے۔ مگر جب فرعون کنارے پر پہنچا تو کچھ ٹھٹک گیا۔ مگر اللہ کو تو اُسے غرق کرنا مقصود تھا اس لیے جبریل علیہ السلام انسانی بھیس میں گھوڑی پر سوار ہو کر آئے اور دریا میں اُتر گئے، فرعون کا گھوڑا گھوڑی کو دیکھ کر شوخی کرنے لگا۔ اور فرعون کو لے کر گھوڑی کے پیچھے پانی میں اُتر گیا، مصریوں نے جب اپنے بادشاہ کو اترتے دیکھا تو سب لوگ اُس کے پیچھے ہو لیے اور منجدھار میں جا کر ڈوب گئے۔ سامری کی پرورش جبریل نے کی تھی لہٰذا وہ اُنہیں خوب پہچانتا تھا جب اُس نے دیکھا کہ جبریل گھوڑی پر سوار جا رہے ہیں تو گھوڑی کے نقشِ قدم کی مٹی بھر مٹی اُٹھالی اور جب موسیٰؑ تورات لینے کے لیے کوہِ طور پر گئے تو سونے چاندی کے زیور جو مصر سے باہر نکلنے کے قبل بنی اسرائیل کی عورتیں قبطیوں سے مستعار لے کر بھاگ آئی تھیں سامری نے اُن سب کو اکٹھا کیا اور تمام زیوروں کو گلا کر ایک بچھڑا بنایا اور اُس کے جوف میں وہی مٹی ڈال دی جو جبریل کی گھوڑی کے نقشِ قدم سے اُس نے اُٹھائی تھی جس کی وجہ سے بچھڑا

زندہ ہوگیا اور بولنے لگا۔ اس طرح کی بہت سی باتیں عرب کے یہودیوں میں مشہور تھیں، ظاہر ہے کہ یہ افسانے انہی کے ذریعہ سے تفاسیر میں بھر لیے گئے۔ قرآن کا دامن ان لغویات سے پاک ہے مگر عجوبہ پرست مترجمین کتاب اللہ کے مُنہ میں بھی اپنی زبان ڈالنے کی کوشش کی ہے چنانچہ متذکرہ آیات کا ترجمہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب سے سنیے۔

"پوچھا کہ سامری تیرا کیا حال ہے؟ اُس نے کہا مجھے وہ چیز دکھائی دی جو اوروں کو نہیں دکھائی دی (جبرئیل کو دیکھا کہ وہ گھوڑی پر سوار جا رہے ہیں) تو میں نے جبرئیل فرشتہ (کی گھوڑی) کے نقش قدم (کی مٹی) سے ایک مٹھی بھر لی پھر اُس کو ڈھلے ہوئے بچھڑے میں ڈال دیا (اور بھائیں بھائیں کرنے لگا) اور (اس وقت) میرے جی میں مجھ کو ایسی ہی صلاح دی۔"

اب ابو مسلم کی تفسیر دیکھیے فرماتے ہیں۔

مفسرین جو بیان کرتے ہیں قرآن میں اس کی کوئی تصریح موجود نہیں یہاں ایک دوسری بات ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ رسول سے جبریل نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور "اَثَرِ الرَّسُوْلِ" سے اُن کی سنت اور طریقہ مراد ہے۔ جس کی پابندی کا انہوں نے حکم دیا تھا جب کوئی کسی کے طریقہ پر کاربند ہوا کرتا ہے تو کہتے ہیں فلان یقفوا اثر فلان و یقبض اثرہ، یا فلان یقبض اثر فلان "یعنی فلاں فلاں کی روش کی پیروی کرتا ہے اور اُس کے نقوش قدم پر چلتا ہے" مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ جب سامری کو ملامت کرنے لگے اور پوچھا کہ کیا بات تھی کہ کیوں سالہ کے ذریعہ تو نے لوگوں کو گمراہ کر ڈالا تو اُس نے جواب دیا کہ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ "مجھے وہ سوجھی جو کسی کو بھی نہیں سوجھی تھی" یعنی مجھے معلوم ہوگیا کہ تمہارا طریقہ درست نہیں ہے پیغمبر پہلے میں نے تمہارے اثر کو کچھ قبضہ میں کر لیا تھا یعنی تمہارے طریقہ و مذہب کا پابند تھا پھر میں نے اسے چھوڑ دیا یہ سُن کر حضرت موسیٰؑ نے اُسے بتایا کہ اس کا کیا انجام ہونے والا ہے اور دنیا و آخرت میں اُسے کیا عذاب ہوں گے۔ سامری نے رسول کہہ کر حضرت موسیٰ سے اسطرح کی باتیں کی تھیں

جیسے کسی غائب کا تذکرہ ہو۔ اسی لیے مفسرین نے رسول سے جبرئیلؑ مراد لیے ہیں۔ لیکن اس سے حضرت موسیٰ ہی مراد ہیں۔ اور اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی بڑے آدمی سے کوئی اُس کے روبرو کہے "اس معاملے میں امیر کا کیا حکم ہے؟" یا "فلاں مسئلہ میں بادشاہ سلامت کیا فرماتے ہیں"۔ رہی یہ بات کہ سامری تو منکر تھا پھر اُس نے حضرت موسیٰؑ کو رسول کہہ کر کیوں مخاطب کیا؟ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کفار کا یہ قول نقل کیا ہے "یٰاَیُّھَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْہِ الذِّکْرُ اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ" (اے وہ شخص کہ جس پر وحی اُتری ہے بے شک تو مجنون ہے) حالانکہ ان کافروں میں کوئی بھی پیغمبر صلعم پر وحی اترنے کا قائل نہ تھا۔

امام رازی نے اس مضمون کو حرف بحرف نقل کیا ہے اور پھر فرماتے ہیں:۔

"واضح ہو کہ ابو مسلم کا یہ قول مفسرین کے اقوال کے خلاف تو ہے لیکن یہ قول تحقیق کے بہت قریب ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ رسول کے نام سے مشہور نہ تھے اور نہ ہی اُن کا کہیں پہلے تذکرہ آیا ہے کہ اُن کے نام پر الف لام تعریف آتا اور اس سے جبریل مراد ہوتے۔ الرسول کہنا اور اس سے جبریل مراد لینا تو گویا علم غیب کی تکلیف دینا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس صورت میں ضمیر لانے کی ضرورت پڑتی ہے یعنی "اثر حافر فرس رسول" (رسول کے گھوڑے کے سم کا نشان) اور یہ ضمیر خلاف اصل ہے۔ تیسرے یہ کہ اس توجیہ میں ضرور تکلف کرنا پڑے گا کہ تمام لوگوں میں ایک سامری نے ہی اکیلا جبرئیلؑ کو کیونکہ دیکھا اور پھر پہچان بھی لیا کہ یہ جبرئیلؑ ہیں پھر اُسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ جبرئیل کی گھوڑی کے سُم کی مٹی میں یہ اثر ہے کہ وہ زیورات سے بنے ہوئے بچھڑے کے پیٹ میں ڈالی جائے تو وہ بول پڑے گا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ جبرئیلؑ نے سامری کو پالا تھا تو یہ امر بھی بعید از قیاس بات ہے۔ اگر سامری نے اُس زمانہ میں جبرئیلؑ کو پہچانا ہو تا جب اُسے پوری عقل آ چکی تھی تو اُسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سچے پیغمبر ہیں اس صورت میں وہ گمراہ کرنے کا قصد کیسے کر سکتا تھا۔ اور اگر اُس نے بلوغ کے زمانہ میں جبرئیلؑ کو نہیں پہچانا تھا تو لڑکپن میں جبرئیلؑ کا اُس کو پالنا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ چوتھی دقت یہ ہے کہ اگر تسلیم کر لیا

جائے کہ مٹی کی ایسی تاثیر سے اگر کفار واقف ہو سکتے ہیں تو معترض کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ عجب نہیں حضرت موسیٰؑ نے ایسی ہی تاثیر والی کوئی اور چیز پالی ہو اور اسی کے اثر سے معجزات صادر ہوئے ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معجزات میں طعن کرنے کی ایک اور سبیل نکل آئے گی اور معترض یہ کہہ سکے گا کہ ممکن ہے انبیاء علیہم السلام کو کوئی ایسی چیزیں مل گئی ہوں جن کی خاصیت سے معجزات صادر ہو سکتے ہوں۔ غرضیکہ یہ وہ صورت ہے کہ اگر افسانہ کو صحیح مانیں تو معجزات کا دروازہ بند ہو جائے سامری کا یہ کہنا کہ "كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ" (ایسا ہی میرے جی میں آیا) اس کا یہ مطلب ہے کہ میرے نفس نے جو تحریک کی میں اسی پر کاربند ہوا۔ سَوَّلَتْ سوال سے ماخوذ ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کیا کسی دوسرے کی تحریک سے نہیں بلکہ اپنی خواہش نفس کی پیروی کی۔

سامری کا انجام

فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ۔

دور ہو دنیا میں تیرے لیے یہی عذاب ہے کہ کہے دیکھ مجھے چھو نہ جانا۔

ابو مسلم کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ دنیا کی زینت اس سے چھین لی گئی یعنی اس کی اولاد نہ ہوئی لا مساس کے معنی ملنے جلنے سے ممانعت کے بھی لیئے جا سکتے ہیں اس کی ضلالت دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے حکم دے دیا کہ خبردار زندگی بھر کسی سے نہ ملنا۔

زرقا کے معنی

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا۔ (۲۰/۱۰۲)

جس روز صور میں پھونکا جائے گا اور ہم اس روز مجرموں کو اکٹھا کریں گے جس روز ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

ابو مسلم کے نزدیک زرقہ سے مراد ان کی آنکھوں کا کھلا رہ جانا ہے یہ آنکھ کی کمزوری ہے کہ

وہ کھلی کی کھلی رہ جائے۔ اور یہ حال اُس شخص کا ہوتا ہے جو اپنا انجام دیکھ کر یا اچانک مصیبت کو سامنے دیکھ کر خوفزدہ ہو جائے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اُس روز تک انہیں مہلت دے گا جس روز اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

صَفْصَفًا کے معنی

فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا (٢٠/١٠٦) پس اُن کو صاف ہموار میدان کر چھوڑا۔

ابومسلم کے نزدیک اِلقاع الارض سے مراد زمین کی برابری اور ہمواری ہے اور یہی معنی صفصفا کے بھی ہیں۔

ظلم و ہضم

فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (٢٠/١١٢) تو اُسے نہ ظلم کا خوف ہوگا نہ حق تلفی کا۔

ابومسلم کے نزدیک یہاں ظلم ثواب میں نقص کے معنوں میں آیا ہے اور ہضم کے معنی یہ ہیں کہ عظمتوں میں سے پورا حصہ نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو مسلمانوں کی شان کے خلاف قرار دیا ہے۔

وسوسہ شیطانی

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ (٢/١٢٠) پس شیطان نے اُس کی طرف وسوسہ ڈالا۔

ابومسلم کے نزدیک وسوسۂ شیطانی سے دنیاوی مصالح میں نافرمانی مراد ہے اور کے بھی یہی معنی ہیں۔

قَالَ اهْبِطَا میں تثنیہ اور جمع کی بحث

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ فرمایا تم دونوں اپنی تمام جزئیات کے ساتھ

لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى ۚ — اِس جگہ سے نکل جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو سو اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آوے.....

"ابو مسلم کے نزدیک یہاں خطاب آدم علیہ السلام اور اُن کے ساتھ اُن کی اولاد اور ابلیس اور اُس کے ساتھ اُس کی اولاد سے ہے اور چونکہ یہ دو جنسیں ہیں اس لیے "اِهْبِطَا" کا تثنیہ لانا جائز ہے اور دونوں جنسوں کی اولاد سے کثرت مراد لے کر "فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ" میں جو جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے وہ بھی درست ہے۔

مدِّ عین

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ (۲/۱۳۱) — اور اپنی آنکھیں اُس کے پیچھے لمبی نہ کر.......

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اس سے آنکھ پھیلانا مراد نہیں بلکہ "مدِّ عین" کنایتاً افسوس کے لیے آتا ہے، یعنی جو کچھ تجھے اس دنیا میں نہیں ملا اور تیرے دشمنوں کو ملا ہے، اس پر افسوس نہ کر۔

رزق

نَحْنُ نَرْزُقُكَ (۲/۱۳۲) — ہم تجھے رزق دیتے ہیں۔

ابو مسلم کہتے ہیں چونکہ اس آیت کے پہلے حصے میں صلوٰۃ کا حکم ہے اس لیے یہاں رزق سے عبادت مراد ہے اور عبادت سے وہ ٹیکس مراد نہیں جو غلاموں سے مالک وصول کرتے ہیں یہ صلوٰۃ انسان کے رزق روحانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہی وہ رزق ہے جو آخر کار کام آتا ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

سُورۃ الانبیاء

رتق و فتق

كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ‏(۲۱/۳۰) آسمان اور زمین دونوں بند تھے تو ہم نے انہیں کھولا۔

ابومسلم کے نزدیک یہاں فتق سے ایجاد مراد ہے اور ایجاد سے پہلے کی حالت کو رتق سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آگ سے خطاب

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ‏(۲۱/۶۹) ہم نے کہا اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا۔

ابومسلم کہتے ہیں یہاں آگ سے خطاب نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مراد ہے کہ اللہ نے آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا۔ اور خطاب کا طریقہ اس لیے استعمال کیا گیا کہ اللہ کا کسی چیز کو کسی کام کے لیے خطاب کرنا در اصل اس کام کے ہو جانے پر دلالت کرتا ہے چنانچہ فرمایا اِذَا اَرَادَ شَيْئًا فَيَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (جب وہ کسی کام کا ارادہ کرے تو "کن" کہتا ہے اور کام ہو جاتا ہے)

امامت سے مراد

وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ‏(۲۱/۷۳) ہم نے انہیں امام بنایا وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔

ابومسلم کے نزدیک یہاں امامت سے نبوت مراد ہے ۔

اَلْاِیْذَانُ عَلٰی سَوَآءٍ کے معنی

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ (۲۱/۱۰۹) — پھر اگر پھر جائیں تو کہہ دے میں نے تمہیں انصاف کی بات بتاکر خبردار کر دیا ہے ۔

عام مفسرین کا خیال ترجمہ سے ظاہر ہے ، ابومسلم "الایذان علی سواء" سے "لڑائی کے لیے اونچی آواز سے پکارنا" مراد لیتے ہیں جیسا اس قول سے ظاہر ہے فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۔ ابومسلم کہتے ہیں کہ اس آیت میں مشرکین کا لفظ مقدر تسلیم کرنا جائز ہے کیونکہ اسلام کی مخالفت میں ان کی کوششیں شدید تھیں ۔

تو آیت کے یہ معنی ہوئے کہ اگر وہ پھر جائیں تو کہیے کہ "میں تمہیں مقابلہ کے لیے بلاتا ہوں"

سُورۃ الحج

بے علمی

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطَانٍ مَّرِيْدٍ (۲۲/۳)

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے چلتا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہ آیت ایسے بے علم لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو سرکش شیطان کی تقلید پر تو ہر وقت تیار رہتے ہیں لیکن اللہ کے آگے سر نہیں جھکاتے۔

غیظ

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ (۲۲/۱۵)

جسے یہ خیال ہے کہ اللہ اُس کی دنیا اور آخرت میں مدد نہیں کرے گا تو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ذریعہ سے آسمان پر لے جائے پھر اُسے کاٹ دے پھر دیکھے کہ کیا اُس کی تدبیر اس چیز کو دور کر دیتی ہے جو اُسے غصہ میں لاتی ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک اس کے معانی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ نصرت الٰہی تو رسول کی تائید میں یقیناً ظاہر ہو گی، جو شخص اس بات پر ناراض ہو کہ یہ نصرت نبی کو کیوں مل رہی ہے تو چاہیے کہ وہ کسی ذریعہ سے آسمان پر پہنچ جائے اور اس نصرت کا رشتہ دنیا سے کاٹ دے۔ عام مفسرین نے یہاں سما سے گھر کی چھت مراد لی ہے اور سبب کو رسی قرار دے کر یہ معنی

پیدا کیسے ہیں کہ اللہ فرماتا ہے کہ ایسا شخص چھت سے لٹک کر خودکشی کرلے۔

وحی اور القائے شیطانی

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ۔ (۲۲/۵۲)

مفسرین اس آیت کی شان نزول میں یہ عجیب و غریب قصہ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلعم پر جب کفار کے حالات گراں گزرنے تو آپ کو خیال ہوا کہ کاش کوئی ایسی آیت نازل ہوتی کہ قریش کی نفرت ختم ہو جاتی۔ ایک روز آپ قریش کی محفل میں بیٹھے تھے کہ سورۂ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى اتری اور آپ نے اسے پڑھنا شروع کیا، جب ان آیات پر پہنچے اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى تو شیطان نے آپ کی زبان سے جاری کرا دیا تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى (یعنی ان نازک اندام اور عالی شان بتوں سے شفاعت کی امید ہے)۔ قریش نے جب یہ سنا تو بہت خوش ہوئے۔ سورت کے آخر میں حضورؐ نے سجدہ کیا تو بس قریش نے بھی ساتھ ہی سجدہ کیا۔ جبرئیلؑ نے حضورؐ سے کہا کہ آپ نے یہ الفاظ اپنی طرف سے کیوں پڑھ دیئے، تو حضورؐ دل میں بہت خوفزدہ ہوئے اس پر اللہ تعالیٰ نے زیر نظر آیت اتاری۔

یہ قصہ ابن ابی حاتم، طبری اور ابن منذر نے شعبہ کی سند سے اور بزار وابن مردویہ نے امیہ بن خالد کی سند سے روایت کیا ہے اور وہ بھی شعبہ ہی سے روایت کرتے ہیں۔ ابن اسحاق نے محمد بن کعب، موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب اور ابو معشر نے محمد بن کعب کی سند سے روایت کیا ہے،

ابوبکر بن العربی نے بڑی جرأت سے کہا ہے کہ یہ قصہ لغو اور بے اصل ہے۔ قاضی عیاض نے کہا کہ اس کے ناقل ضعیف ہیں روایات مضطرب ہیں اور سند منقطع ہے۔ محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے اس قصہ کے متعلق کہا کہ اسے بے دینوں نے وضع کیا ہے۔ بیہقی نے اس کے سب راویوں میں کلام کیا ہے۔ اور سب کو ملعون قرار دیا ہے۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ ابن حجر اس کی صحت پر مصر ہیں۔

اصل میں تَمَنّٰی کے لفظ پر اتنی بڑی عمارت اٹھائی گئی ہے کیونکہ مفسرین نے تمنا کے معنی تلاوت کے لیے ہیں اس لیے بعض اس طرف بھی گئے ہیں کہ اصل میں وہ الفاظ حضور کی زبان سے نہیں نکلے تھے بلکہ شیطان نے حضور کی آواز میں آواز ملا کر کہہ دیے تھے۔ جن لوگوں نے تمنا کو خواہش کے معنوں میں لیا انہوں نے کہا کہ حضور کی خواہش یہی تھی۔ ابومسلم کہتے ہیں کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسانوں کے لیے انہیں میں سے انبیاء بھیجے فرشتے نہیں بھیجے گئے اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں کہ وحی کی تلاوت میں شیطانی وسوسہ سے بچا ہو۔ شیطان اس کے ذہن میں وحی کے منافی باتیں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیتا اور نبی کو وحی اور حفظِ وحی پر ثابت قدم کر دیتا ہے۔ اسی کی مثل یہ دوسری آیت ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ (پرہیزگاروں کو جب شیطان کے کسی گروہ نے چھو لیا (یعنی برے خیالات ان کے دلوں میں پیدا کیے) تو انہوں نے اللہ کو یاد کیا یاد کرنا تھا کہ ناگاہ بصیرت والے ہو گئے۔

کتاب

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ كِتٰبٍ ۭ (۲۲/۷۰)	کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے یہ سب کچھ کتاب میں ہے۔

ابومسلم کے نزدیک کتاب کے معنی حفظ اور ضبط کے ہیں پس اللہ کے اس قول سے یہ مراد ہے

کہ یہ سب کچھ (علوم ارضی وسماوی) اللہ کے حفظ وضبط میں ہے۔

کِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ

وَلَدَیْنَا کِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ (۲۳/۶۲) ہمارے پاس کتاب ہے جو سچ سچ بتا دیتی ہے۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ نیک لوگوں کی صفات بیان کرنے کے بعد یہ آیت لائی گئی جس میں بتایا گیا۔ اور یہاں بھی کتاب سے مراد علمِ الٰہی ہے، ربطِ آیات اس طرح ہے کہ پہلے مشفقین کی صفات بیان فرمائیں اور ان کے اعمال واضح طور پر بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ نیکیاں وہ اس لیے کر رہے ہیں کہ اللہ کسی آدمی کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اور پھر نیکیوں کا پورا پورا بدلہ دیتا ہے اور کچھ بھی کمی نہیں کی جاتی۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ ربط بالکل صحیح ہے اور اس ربط کی نسبت بہتر ہے جو اس آیت کو بعد کی آیات سے دیا جاتا ہے۔

شُکر

قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ (۲۳/۷۸) بہت ہی کم تم شکر کرتے ہو۔

ابومسلم کہتے ہیں پہلے اللہ تعالٰے نے اپنی نعمتیں گنائیں اور بتایا کہ اللہ نے تمہیں سماعت و بصارت اور افئدہ دیئے یعنی حواس ظاہری و حواس باطنی عطا فرمائے پھر فرمایا قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم شکر تو ادا کرتے ہو مگر تھوڑا بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم شکر ادا ہی نہیں کرتے جیسے کسی منکر نعمت کو کہا جاتا ہے اقل شکر فلان۔

ذَرَاَکُمْ کا مطلب

وَھُوَ الَّذِیْ ذَرَاَکُمْ فِی الْاَرْضِ اور وہی جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا۔

ابومسلم کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں اولاد در اولاد زیادہ کیا کیونکہ ذَرَاَ سے ہی ذُرِّیّتْ کا لفظ ہے۔

شِقْوَتْ کا مفہوم

قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا۔ (۲۳/۱۰۶)

کہیں گے اے رب ہمارے ہم پر بدبختی غالب آئی۔

ابومسلم فرماتے ہیں کہ شقوت کا مصدر الشقاء ہے جیسے حریۃ کا مصدر جری ہے۔ بعض اوقات لفظ بطور فعل آتا ہے لیکن اس سے حالت مراد ہوتی ہے جیسے جلسہ حسنہ رکبہ، فعل کا؛ اور یہ حالتوں کا اظہار ہے اور کہا جاتا ہے کہ عاش فلان عیشۃ طیبۃ وماتَ میتۃ کریمۃ" یعنی فلاں نے بہت ہی سکون کی زندگی بسر کی اور عزت کی موت مرا، اسی طرح شقوت سے مراد بدبختی کی حالت ہے۔

رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْم

لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ

اُس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ معزز عرش کا رب ہے۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ عرش یہی آسمان ہیں جن کے گرد ملائکہ طواف کرتے ہیں، اور اس سے عظیم سلطنت بھی مراد لی جاسکتی ہے۔

سُورۃ النُّور

آیات بیّنات

فِیْهَا اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ (۲۴/۱) اس میں آیات بینات ہیں۔

ابومسلم کے نزدیک آیات بینات سے وہی احکام و حدود مراد لیے جاسکتے ہیں جو اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں۔

نکاح کے معنی

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۲۴/۳)

بدکار مرد سوائے بدکار یا مشرک عورت کے کسی سے تعلقات پیدا نہیں کرتا اور بدکار عورت سوائے بدکار مرد اور مشرک کے تعلقات پیدا نہیں کرتی اور یہ مومنوں پر حرام کیا گیا۔

ابومسلم کہتے ہیں نکاح کا لفظ وطی پر بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہاں "زانی" اور "زانیہ" کے الفاظ کے قرینہ سے نکاح زنا کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہو کیونکہ نکاح مسلمانوں پر حرام نہیں زنا حرام ہے۔

واقعۂ افک کا سب سے بڑا گناہگار

وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۲۴/۱۱)

ان (واقعہ افک کے گناہگاروں) میں سے جس نے بڑا بوجھ اپنے ذمہ لیا اس کے لیے بڑا دکھ ہے۔

ابومسلم کا قول ہے کبرہٗ کی اضافت اِس لیے ہوئی کہ جس نے واقعۂ افک کا الزام تراشا، جس نے اِسے پھیلایا یا اُسے اس گناہ کا بڑا شوق تھا۔

دُنیاوی عذاب

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ (۲۴/۱۹)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی کی مسلمانوں میں اشاعت ہو اُن کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

ابومسلم کہتے ہیں دنیا کا عذاب یہی ہے کہ رسولِ خدا صلعم اُن کے خلاف جہاد کریں۔ ارشادِ باری ہے جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ (کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کرو۔

یَاْتَلِ کے معنی

وَلَا یَاۡتَلِ اُولُوا الۡفَضۡلِ مِنۡکُمۡ وَ السَّعَۃِ

اور تم میں سے صاحب فضل و وسعت لوگ یہ قسم نہ کھائیں کہ اقربیوں، مسکینوں اور مہاجروں کو کچھ نہ دیں گے۔

مشہور معنی ترجمہ سے ظاہر ہیں، ان مفسرین کا خیال ہے کہ یَاْتَلِ" الیہ سے ہے جس کے معنی قسم کھانے کے ہیں لیکن ابومسلم کو ان سے اختلاف ہے جس کی دو وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ پھر آیت کے ظاہری معنی اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ عطا کرنے کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے حالانکہ مقصد اس کے برعکس ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عربی میں افتعلت افعلت کی بجائے استعمال نہیں ہوتا اور حالت یہ ہے کہ الیت، الیۃ سے افعلت ہو ایسے افتعلت نہیں کہا جائے گا جیسے الزمت سے التزمت اور اعطیت سے اعطیت نہیں کہا جائے گا۔

یَاْتَلِ اصل میں یاتلی ہے جزم کی وجہ سے "ی" محذوف ہو گئی ولا یال اور ولا یاتل دونوں ایک ہیں اور مراد یہ ہے کہ ان کے ساتھ نیکی میں کمی نہ کرو اور فعلت کی بجائے افتعلت کا استعمال عام ہے

جیسے کسمیت سے اکتسیت بس یہ صحیح تاویل ہے۔

ہدایت اور نور

يَهْدِي اللّٰهُ لِنُورِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۝ اللہ اپنے نور کے لیے جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

ابومسلم کے نزدیک ہدایت کے تین درجے ہیں (۱) سیدھی راہ دکھانا (۲) سیدھی راہ پر چلانا۔ (۳) منزلِ مقصود پر پہنچا دینا اور کامیاب کرنا۔

ہدایت کے پہلے معنی عام ہیں۔ دوسرے معنی کی طرف یہ آیت دلالت کرتی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (اے اللہ ہمیں سیدھی راہ پر چلائے رکھ)۔ تیسرے معنوں کی طرف وہ آیات اشارہ کرتی ہیں جن میں ہے کہ جنتی کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدٰنَا لِهٰذَا ایک اور جگہ فرمایا اِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (میں اسی کے لیے بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی، ایمان لایا اور صالح اعمال کیے پھر وہ کامیاب ہوگیا)۔

اور نور سے مراد ہے انتہائی کامرانی و سرفرازی بس یہ آیت اس آیت کی مثال ہے جس میں جنتیوں کے متعلق کہا گیا يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (ان کا نور رہنمائی کے لیے ان کے آگے ہوگا)۔

خلال

فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ (۲۴/۴۳) پھر تو بارش کو اس کے اندر سے نکلتا دیکھتا ہے۔

ابومسلم کے نزدیک خلال جمع ہے خلل کی جیسے جبال، جبل کی جمع ہے اور پانی بادل کے پھٹنے سے برستا ہے۔

سُورۃ الفُرقان

اِفتراء

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨ افْتَرٰىهُ (۲۵/۴)

اور کافر کہتے ہیں یہ تو نرا جھوٹ ہے جو اس نے گھڑ لیا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں افترا، فریت سے افتعال ہے۔ بُرائی کو ختم کرنا اور اس کا سر کُچلنا مقصود ہو تو کہا جاتا ہے افتریت و افتریتُ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو کسی کو ایسی گالی دے یا کسی پر ایسی بات سے لعنت کرے جو فی الواقع اُس میں موجود نہ ہو تو "افترای علیہ" استعمال ہوتا ہے۔

ظُلم و زُور

فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا (۲۵/۴)

پس وہ ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوتے۔

ابو مسلم فرماتے ہیں اُن کا ظلم یہ ہے کہ اُنھوں نے رسول کی تکذیب کی اور زور اُس جھوٹ کو کہا گیا ہے جو حضورؐ کے متعلق اُنھوں نے پھیلایا۔

قرآن نازل کرنے والا کون ہے؟

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۵/۶)

فرما دیجیے یہ کتاب تو اُس نے نازل کی ہے جو آسمان اور زمین کے بھیدوں سے واقف ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ قرآن تو اُس خدا نے نازل کیا جو زمین آسمان کے بھیدوں سے واقف ہے

پس اگر نبی صلعم اپنی طرف سے آیات بناکر اُس کی طرف منسوب کرتے تو وہ ضرور انتقام لیتا، کیونکہ اُس نے فرمایا ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ۔

اگر نبی بعض اقوال اپنی طرف سے گھڑ کر ہم سے منسوب کرتے تو ہم اُسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور اُس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔

غفورٌ رحیم

إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا (۲۵/۶)

ہاں وہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالےٰ نے لوگوں کو ڈرانے اور سیدھی راہ پر چلانے کے لیے احکام نازل فرمائے تو ضروری ہے کہ وہ غفور الرحیم ہو یعنی سزا دینے میں جلدی کرنے والا نہ ہو۔

جنّتُ الخُلد

قُلْ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ (۲۵/۱۵)

فرمائیے کیا یہ بہتر ہے یا ہمیشگی کا باغ۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ جنت الخلد وہ ہے جس کے نعائم ہمیشہ کے لیے ہیں۔ خلد اور خلود برابر ہیں جیسے شکر اور شکور۔

قولِ رسُول

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (۲۵/۳)

اور رسول نے کہا اے میرے رب میری قوم نے قرآن کو چھوڑی ہوئی چیز کی طرح قرار دیا۔

اکثر مفسرین کے نزدیک یہ قول دنیا میں واقع ہو چکا لیکن ابو مسلم کہتے ہیں کہ آخرت سے متعلق ہے

قیامت کے روز انبیاء کی گواہی لی جائے گی فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا (اور اس وقت کیا ہوگا جب ہر قوم پر گواہ آئے گا اور آپ کو بھی گواہ بنایا جائے گا۔ اس وقت حضور فرمائیں گے: اے میرے رب میری قوم نے قرآن کو چھوڑی ہوئی چیز قرار دیا تھا)۔

انبیاء کے دشمن

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ (۲۵/۳۱) — اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے دشمن بنائے۔

ابومسلم کے نزدیک "عدو" سے مراد دور کا دشمن ہے نہ کہ نزدیک کا کیونکہ معاداۃ سے بُعد (دوری) کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے جیسے نصر میں قربت کا مفہوم شامل ہے پس اللہ نے مسلمانوں اور کافروں میں بُعد پیدا کر دیا۔

اصحاب الرس

وَعَادًا وَثَمُودَ وَأَصْحَابَ الرَّسِّ۔ — اور عاد اور ثمود اور اصحاب الرس (۲۵/۳۸)

ابومسلم فرماتے ہیں کہ بلادِ عربیہ میں ایک جگہ کا نام الرس ہے ہوسکتا ہے کہ یہی وادی ان لوگوں کی قرارگاہ ہو۔ عربی میں رس کے معنی دفن کرنے کے ہیں اور قبر کے گڑھے کو بھی رس کہتے ہیں چنانچہ "رس المیت" کے معنی مُردے کو دفن کرنے اور چھپا دینے کے ہیں۔ اس سے کنواں بھی مراد لیا گیا ہے، بہرحال جو کچھ بھی ہو اللہ نے اُن کی ہلاکت کی خبر دی ہے۔

یہ الفاظ نقل کرکے امام رازی فرماتے ہیں "جاننا چاہیے کہ ابومسلم نے یہ بڑی پتے کی بات کی ہے کہ ان کے حالات نہ قرآن میں ملتے ہیں نہ صحیح حدیث سے ثابت ہیں لیکن اُن کی ہلاکت کا سبب واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ یہ اُن کے کفر کی وجہ سے تھی۔

سُبات

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا (۲۵/۴۷)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور دن کو موجب آرام بنایا۔

ابومسلم کا قول ہے کہ سبات سے آرام ہے اور اسی سے یوم السبت ہے یعنی آرام کا دن جب بیمار کو بیماری کی تکلیف سے نجات ہوتی ہے اور آرام آجاتا ہے تو اُسے مسبوت کہتے ہیں۔

ظہیر کا صحیح مفہوم

وَ کَانَ الْکَافِرُ عَلٰی رَبِّہٖ ظَھِیْرًا (۲۵/۵۱)

اور کافر اپنے رب کے خلاف دوسروں کی پشت پناہی کرتا ہے۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ ظہیر کا صحیح مفہوم عربی کے اس محاورے میں پنہاں ہے "ظہر فلان بحاجتی" فلاں نے میری حاجت سے پیٹھ پھیرلی۔ اور اس پر قیاس کرتے ہوئے اس کے معنی خفیف اور متروک ہوئے۔

اثام کے معنی

وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا (۲۵/۶۸)

اور جو کوئی ایسا کرے وہ اپنے گناہ کی سزا پائے گا۔

ابومسلم کہتے ہیں اثم اور اثام ایک چیز ہیں اور یہاں اثام گناہوں کے بدلہ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ کسی اسم کو اُس کے بدل پر بھی اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

سورۃ القصص

فراغ کا مطلب

فَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فَارِغًا (۲۸/۱۰) اور موسیٰ کی والدہ کا دل خالی ہو گیا۔

ابو مسلم کے نزدیک فراغ الفواد سے مراد خوف اور ڈر ہے۔

اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (۲۸/۴۱) اور ہم نے انہیں آگ کی طرف بلانے والے پیشرو بنایا۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ امامت سے مراد تقدم ہے جب اللہ نے ان پر عذاب نازل کیا تو وہ اپنے بعد میں آنے والے کفار کے لیے متقدمین کا درجہ رکھتے ہیں۔

مفاتح

وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ (۲۸/۷۶) اللہ نے اُسے اتنے خزانے دیے کہ اس کے خزانے ایک طاقتور جماعت کے لیے اُٹھانے مشکل تھے۔

ابو مسلم کے نزدیک مفاتح سے مراد چابیاں نہیں بلکہ احاطہ مراد ہے گویا یہ بیان کیا گیا کہ ہم نے اُسے اس قدر خزانے دیے کہ ان کی حفاظت اور احاطہ کے لیے ایک طاقتور جماعت کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اس کی قوم میں ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے اُسے کئی امور کے متعلق نصیحتیں کی تھیں پہلی نصیحت یہ تھی کہ اُسے اپنی دولت پر مغرور نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اللہ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔ دنیاوی

مال و دولت کا خمار اُسی کو اندھا کرتا ہے جو یہ گمان کر بیٹھتا ہے کہ اب کوئی طاقت مجھے دولت کے ان ڈھیروں سے جدا نہیں کر سکتی، اور جسے معلوم ہو کہ اس کی ساری دولت دھری رہ جائے گی اور وہ بھرے پُرے خزانے چھوڑ کر خالی ہاتھ چلا جائے گا تو وہ اس دولت سے خوش نہیں ہوتا۔
متنبی نے کیا خوب کہا ہے:

اشد الغم عندی فی سرور
تیقن عنه صاحبه انتقالا

(میرے نزدیک عیش ونشاط شدید ترین غم ہے کیونکہ صاحب سرور کو یقین ہوتا ہے کہ وہ دیرپا نہیں)۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ اس کی یہ مسرت و انبساط بھی شرک تھی کیونکہ اس کے ساتھ اس کو اللہ کی سزا کا خوف نہ تھا۔

سورۂ والصّٰفّٰت

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا کے معنی

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا (۳۷/۱)   گواہ ہیں صف باندھنے والی جماعتیں۔

مفسرین نے اس سے فرشتے مراد لیے ہیں مگر ابو مسلم کہتے ہیں اس لفظ کا ملائکہ پر محمول کرنا جائز نہیں کیونکہ یہاں تانیث آئی ہے اور ملائکہ اس صفت تانیث سے پاک ہیں۔

سورۃ الزمر

ارض اللہ

لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ ؕ وَ اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ ؕ (۳۹/۱۰)

جن لوگوں نے بھلائی کی اُن کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے اور "ارض اللہ" وسیع ہے۔

اگر یہاں "ارض اللہ" سے مراد اللہ کی زمین لی جائے تو بظاہر دونوں آیات غیر مربوط معلوم ہوتی ہیں اسی لیے ابومسلم نے "ارض اللہ" سے جنت مراد لی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جس نے بھلائی کی تو دنیا میں اُسے بھلائی ملے گی"۔ اس کے بعد خود بخود ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ انہیں دنیا میں تو بھلائی ملی آخرت میں کیا ملے گا پس آیت "اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ" سے یہی مراد لینی ہوگی کہ آخرت میں اُسے جنت ملے گی جو بہت وسیع ہے۔

سُورۃ المُومنون

یَومُ الْاٰزِفَۃِ کے معنی

وَ اَنْذِرْھُمْ یَوْمَ الْاٰزِفَۃِ
انہیں موت کے دن سے ڈرا۔

ابومسلم "الْاٰزِفَۃِ" سے موت کا دن مراد لیتے ہیں۔ اللہ نے یوم قیامت کی صفت "یوم التلاق"، اور "یَوْمَ ھُمْ بَارِزُوْنَ" کے لفظ استعمال کیے ہیں۔ اس آیت میں فرمایا کہ انہیں الآزفہ سے ڈراؤ، تو لازم ہے کہ آزفہ سے قیامت کے بجائے کوئی اور دن مراد لیا جائے جس طرح یہ آیات ہیں فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ اور کَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ تو ان سے قیامت کے بجائے موت کا دن مراد لینا زیادہ صحیح ہے۔

سورۃ الحدید

جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ

لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۔ (۵۷/۱۰)

تم میں سے وہ برابر نہیں کہ ایک نے تو فتح سے پہلے خرچ کیا اور دوسرے نے فتح کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فتح سے پہلے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی عظمت بیان فرمائی ہے۔

ارجعوا کا مفہوم

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِن نُّورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا (۵۷/۱۳)

جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں کو کہیں گے ہمارا انتظار کرو ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لیں گے کہا جائیگا اپنے پیچھے کو لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو۔

ابو مسلم کے نزدیک "ارجعوا" سے مراد منافقوں کو روشنی سے منع کرنا ہے جس طرح کوئی شخص کسی ایسے آدمی کو جو اس سے قریب ہونا چاہے کہے "وراءک اوسع لک" تیرے پیچھے کی جگہ تیرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ اس جگہ "ارجعوا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مقصود تک پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں پائیں گے۔ امر مراد نہیں۔

سورة المجادلة

ظہار

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ط (۵۸/۳)

اور جو لوگ اپنی عورتوں کو مائیں کہہ دیتے ہیں پھر اس کی طرف واپس لوٹتے ہیں جو کہا تھا تو ایک غلام کا آزاد کرنا ہے اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں

ابومسلم کہتے ہیں کہ عود کا لفظ اس مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ غلام تبھی آزاد کرنا ہوگا جب وہ آدمی ظہار کے الفاظ میں قسم بھی کھائے کیونکہ جو آدمی یہ کہے کہ "فلاں چیز مجھ پر آدمی کے گوشت کی طرح حرام ہے اور قسم نہ کھائے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ اور جب قسم کھا کر یہی الفاظ دہرائے تو کفارہ لازم ہے۔

محادہ کا مفہوم

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۵۸/۵)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں ذلیل کیے جائیں گے جس طرح ان کے پہلے مخالفتِ حق کرنے والے ذلیل کیے گئے۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ محادہ، حدید سے مقاعلہ اور اس سے مراد لوہے کے ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا ہے چاہے حقیقتاً تلوار سے جنگ کی جائے یا سخت جھگڑے کو اس سے تشبیہ دی جائے عام مفسرین اسے یحادون اور یشاقون کے مترادف سمجھتے ہیں جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے۔

سورۃ المُلک

خدا کے متعلق کفّار کا عقیدہ

ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ — کیا تم اُس سے نڈر ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں

یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ فَاِذَا ہِیَ تَمُوۡرُ (۶۷/۱۶) — زمین سے نابود کر دے پس وہ اچانک کانپنے لگے گی۔

ابو مسلم کہتے ہیں اہل عرب اللہ کے وجود کے قائل تھے مگر اُن کا اعتقاد یہ تھا کہ اللہ آسمان میں ہے جس طرح مسلمانوں کے ایک فرقہ مشبّہہ کا عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ قطعی باطل ہے، خود اللہ کا ارشاد ہے وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ۔ اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اگر تم نے اللہ کو آسمانوں میں مقید مان رکھا ہے اور اسی لیے نڈر ہو گئے ہو تو سمجھ لو کہ وہ تمہیں زمین میں بھی تباہ کر سکتا ہے، وہ اگر چاہے تو زمین کانپنے لگے۔

یَقُوۡلُوۡنَ کا اطلاق ماضی پر ہے

وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡوَعۡدُ — اور کہتے ہیں وعدہ کب ہے اگر تم

اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (۶۷/۲۵) — سچے ہو۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ "یَقُوۡلُوۡنَ" میں مستقبل، حال، اور ماضی کا احتمال ہو سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں ماضی مراد لیا جائے کیونکہ ان کے قول کے بعد اللہ اُن کی بات دُہرا کر کہہ رہا ہے کہ اے نبی کہہ دیجیے اس کا علم اللہ کے پاس ہے گویا یقولون کی تقدیر یوں ہو گی "فکانوا یَقُوۡلُوۡنَ"۔

سُورۃُ القَلَم

کشفِ ساق

یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ وَّ یُدۡعَوۡنَ اِلَی السُّجُوۡدِ فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ (۶۸/۴۲)

جس روز شدت ظاہر ہوگی وہ سجدے کے لیے بلائے جائیں گے پس نہ کر سکیں گے۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ اس آیت کو قیامت کے روز پر محمول کرنا قطعاً ناجائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دن کی صفت میں فرمایا ہے کہ وہ سجدہ کرنے کے لیے پکارے جائیں گے اور عبادت کا مکلف تو انسان دنیا میں ہے قیامت میں نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے مراد دنیا کا آخری دن یا موت کا دن ہے کیونکہ تم دیکھتے ہو کہ نزع کے وقت بھی صلوٰۃ کی طرف پکارا جاتا ہے، اذان ہوتی ہے حی علی الصلوٰۃ کی منادی سے اُن کو مسجد میں بلایا جاتا ہے مگر وہ صلوٰۃ ادا نہیں کر سکتے۔ وہ وقت ہی ایسا ہے کہ ایسے وقت میں کسی شخص کے لیے خدا پر ایمان لانا بھی مفید نہیں ہو سکتا۔

اور تُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ کے معنی شدّتِ امر کے ہیں۔

وَعن عکرمۃ فی قولہ یکشف عن ساق قال ھو یوم کرب۔

عکرمہ سے روایت ہے کہ "یوم یکشف عن ساق" سے مراد یوم کرب ہے۔

پس ایسی شدت کرب کی حالت میں عبادت کا کس کو خیال رہتا ہے اور ایسے وقت کا ایمان کیا نفع دے سکتا ہے۔

علامہ رازی لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس روز سے قیامت کے روز کی بجائے موت کا دن مراد لیا جائے جیسا کہ ابو مسلم نے کہا ہے۔

سُورۃُ الحاقۃ

الحاقۃ کے معنی

اَلْحَاۤقَّۃُ (۶۹/۱) حق ہونے والی

ابومسلم کہتے ہیں کہ اَلْحَاۤقَّۃُ، حَقَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّکَ" سے الفاعلہ کے وزن پر ہے۔

سُورۃُ المعارج

تَعْرُجُ الْمَلٰۤئِکَۃُ کا مفہوم

تَعْرُجُ الْمَلٰۤئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ (۷۰/۴) فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں۔

ابومسلم کے نزدیک اس دن سے دنیا کی ابتدا اور انتہا مراد ہے یعنی ازل سے ابد تک ملائکہ کا عروج ونزول جاری رہے گا اور اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہے لیکن یہ لازم نہیں آتا کہ قیامت کا وقت معلوم ہو کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ کتنا عرصہ گزر گیا اور کتنا باقی ہے۔

نذر

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (۷۶/۷) وہ نذر پوری کرتے ہیں۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ یہ لفظ بندوں کی طرف سے ہو تو اس کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے اوپر فرض کر لینا جیسے عام طور پر نذر مانی جاتی ہے کہ "اگر مجھے فلاں گم شدہ چیز مل گئی تو اتنا صدقہ کروں گا"۔ اللہ کی طرف سے یہی لفظ وعدے کے معنوں میں آتا ہے۔ پھر مفسرین میں اس کے مصداق کے متعلق اختلاف ہے مثلاً کوئی کہتا ہے کہ "اگر فلاں آدمی گھر میں داخل ہو تو مجھ پر یہ چیز لازم ہوگی"۔ چونکہ اس میں نیکی کا کوئی پہلو نہیں اس لیے بعض لوگ نذر سمجھتے ہیں اور بعض قسم۔

سُورۃُ المُرسَلات

ظِلّ

اِنطَلِقُوٓا اِلیٰ ظِلٍّ ذِی ثَلٰثِ شُعَبٍ ۔ (۷۷/۳۰) — تین شاخوں والے سائے کی طرف چلو۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ یہاں درختوں کا سایہ مراد نہیں بلکہ اس سے مراد دھوئیں کا سایہ ہے آگ کے کسی بہت بڑے الاؤ سے جب دھوئیں کے بادل اٹھتے ہیں تو وہ مختلف شاخوں کی طرح معلوم ہوتا ہے اور خیمہ کی طرح اوپر تن جاتا ہے۔ تین طرح پھوٹنے والے سایہ سے گویا جہنم کی تصویر پیش کی جارہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس آگ کا دھواں مختلف اطراف میں پھیل رہا ہے اور وہ لپکی چلی آرہی ہے۔

بعد کی آیات بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں لَا ظَلِیلٍ وَّلَا یُغنِی مِنَ اللَّھَبِ (جس میں نہ چھاؤں ہے نہ شعلوں کی لپیٹ سے بچاؤ)۔

سورۃ النّٰزعٰت

النّٰزعٰتِ کے معنی

وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۔ گماہ ہیں ڈوب کر نکال لینے والی ۔

جن لوگوں نے " النّٰزعٰتِ " سے فرشتے مراد لیے ہیں ابو مسلم نے اُن کی سخت تردید کی ہے اور کہا ہے النازعات " نازعہ " کی جمع ہے اور یہ لفظ مؤنث کے لیے استعمال ہوتا ہے ، اور ملائکہ کو خود خدا تانیث کی صفت سے پاک قرار دیتا ہے جب کفار کی اس بات کی تردید کی کہ وہ انہیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں ۔

اصل میں یہ آیات مجاہدین کی تعریف میں ہیں اور " النازعات " سے مراد مجاہدین کے ہاتھ ہیں جیسے تیر چلانے والے کو کہتے ہیں " نزع فی قوسہ " اسی طرح " اغرق فی النزع " کا مفہوم ہے اُس نے کمان کا چلّہ چڑھایا ۔ " نَاشِطَات " کے معنی تیروں کا تیر چلانے والوں کے ہاتھ سے نکلنا ہے ۔ " نَشْطَۃً " ، کا لفظ ہر اُس چیز کے لیے جسے حلال کیا گیا ہو نشاط بھی اسی سے ہے جس سے خوشی مراد لی جاتی ہے ۔

" السّابحات " سے مراد گھوڑے ہیں اور اس سے اونٹ بھی مراد لیے جا سکتے ہیں اور مدبرات معنی " معقبات " ہیں ، اور مراد یہ ہے کہ اس کے پیچھے مدد شامل ہے یعنی تیر چلانے اور گھوڑے دوڑانے کے بعد اللہ کی تائید و نصرت آئے گی یہاں تانیث اِس لیے استعمال ہوئی کہ تمام صفات جماعتوں کی ہیں ہو سکتا ہے کہ " مُدَبِّرات " کمانوں کی ڈوریوں کے لیے استعمال ہوا ہو ۔

اور یہ قیامت کے علامات نہیں اس لیے " الرّاجفہ " کے معنی مشرکوں کے گھوڑے اور " الرّادفہ " سے مشرکوں کے گروہ مراد ہیں ۔ " قلوب الواجفہ " کے معنی قلعے اور الابصار

الحافرۃ" کے معنی منافقوں کی آنکھیں ہیں جیسا کہ کتاب اللہ میں ہے الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ یَّنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ (جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے وہ اس طرح تیری طرف دیکھتے ہیں جیسے ان پر موت کی غشی طاری ہو)۔

ان آیات کا مطلب یہ ہوا کہ جب دشمنوں کے گھوڑے قطار اندر قطار آنے لگے تو منافقوں کے دل مضطرب ہو گئے اُن کی آنکھیں بزدلی سے زمین میں گڑ گئیں تو پھر انہوں نے کہا "اِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَۃِ یعنی کیا ہمیں اُلٹے پاؤں لوٹایا جائے گا یا ہم یہ خوف برداشت کریں گے پھر کہا تِلْکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ (ہائے اس لوٹنے میں بھی نقصان ہے)۔ گویا پہلے مشرکین کی لڑائی کا حال بیان ہوا پھر کلام کا رُخ منافقوں کے حال کی طرف پھیر گیا اور آخر میں منافقوں کے اقوال بیان ہوئے۔ پھر اللہ نے انہیں جواب دیا فَاِنَّمَا ہِیَ زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ فَاِذَا ہُمْ بِالسَّاہِرَۃِ (وہ تو صرف ایک ڈانٹ ہوگی اور وہ ایک میدان میں ہوں گے)۔

علامہ رازی کہتے ہیں یہ ابو مسلم کے اقوال ہیں۔ اگرچہ جمہور مفسرین کے خلاف ہیں لیکن قرآن کی آیات میں ان معانی کا احتمال بھی ہے۔

سُورۃ العبس

تیسیر

ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَہٗ، پھر راستہ اُس کے لیے آسان کر دیتا ہے۔

ابومسلم کے نزدیک "اِنَّا ھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ" اور یہ آیت ہم معنی ہیں۔ راستہ آسان کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں راستے واضح کر کے دکھا دیتا ہے کہ یہ حق کی راہ ہے اور یہ باطل کی، اور تیسیر کے لفظ میں اختیار و ارادہ، بعثتِ انبیاء اور کتابوں کا بھیجنا سب شامل ہیں۔

سُورۃُ الانفِطار

ابتدائی عُمر اور آخری عُمر کے گناہ

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ کا مفہوم ابومسلم کے نزدیک یہ ہے کہ پہلی عمر اور آخری عمر کے گناہ معلوم ہو جائیں۔

سُورۃ التطفیف

قیامت کا بیان

يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۳/۶) جس دن لوگ جہانوں کے رب کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

ابومسلم اس آیت کو "قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ" کا مترادف قرار دیتے ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ اس روز تمام نسل انسانی اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑی ہوگی یہ مطلب نہیں کہ اللہ اُن کے سامنے بیٹھا ہوگا۔

حجاب

يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۸۳/۱۵) جس روز وہ اوجھل ہوں گے۔

ابومسلم کے نزدیک "محجوبون" کے معنی ہیں دور ہونے والے، غیر مقرب، اور حجاب رد کے معنوں میں آتا ہے اور یہ قبول کی ضد ہے مطلب یہ ہے کہ منکرین اللہ کا تقرب حاصل نہیں کر سکیں گے اور انہیں اس کے دربار میں قبولیت حاصل نہیں ہوگی" وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ (نہ اللہ ان سے کلام کرے گا نہ دیکھے گا) کا بھی یہی مفہوم ہے کہ ان کے اعمال کو اللہ کے ہاں "قبولیت" حاصل نہیں ہوگی۔

علّیین

اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ نیکوں کے اعمال بلند مقام پر ہیں (۸۳/۱۹)

ابومسلم کے نزدیک کتاب سے مراد کتابت ہے پس معنی یہ ہوئے کہ نیکوں کے اعمال کی کتابت علیین میں ہوگی۔ پھر علیین کی تعریف فرمائی کہ وہ ایک کتاب ہے جس میں تمام صلحاء کے اعمال لکھے ہیں۔ (كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ)۔

سورۃ الاعلیٰ

اسم

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى — اپنے بہت بلند رب کے نام کی تسبیح کر۔

(۸۷ : ۱)

ابومسلم کہتے ہیں کہ یہاں اسم سے مراد یہی صفت "الاعلیٰ" ہے کیونکہ اسماء صفات کو کہتے ہیں وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى"۔

سورۃ البیّنہ

بیّنہ کا مفہوم

حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ (۹۸/۲) — حتّٰے کہ اُن کے پاس کھلی دلیل آئی۔

ابو مسلم کے نزدیک بیّنہ رسول کو کہا گیا ہے اور یہاں یہ مراد ہے کہ اُن کے پاس فرشتوں میں سے رسول آئے اور مقدس صحائف پڑھے۔

حُنَفَآء کے معنی

حُنَفَآءَ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ — راست رو ہوں اور صلٰوۃ قائم کریں
یُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ — اور زکوٰۃ ادا کریں۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ "حنف فی الرجل" کے معنی ہیں پاؤں کے اندر کی طرف ٹیڑھا کرنا۔ اور وہ اس طرح کہ پاؤں کے انگوٹھوں کو انگلیوں کے پیچھے اس طرح لے جایا جائے کہ دونوں انگوٹھے آپس میں مل جائیں۔ پس حنیف وہ ہوا جس نے تمام ادیان سے مُنہ موڑ لیا ہو اور صرف اسلام کا ماننے والا ہو۔

سُورۃ التّکاثُر

کُفّار سے خِطاب

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ (۱۰۲/۱) کثرتِ مال کی خواہش نے تمہیں غافل کر رکھا ہے۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ اللہ قیامت کے روز اسی طرح کفار کو مخاطب کرے گا کیونکہ اُس وقت وہ قبروں میں رہ چکے ہوں گے۔

سورۃ الفیل

عصفٍ مأکُول کے معنی

کَعَصْفٍ مَّأْکُوْلٍ (۱۰۵/۵) کھائے ہوئے بھُس کی طرح

ابومسلم کہتے ہیں کہ عصف بھوسے کو کہتے ہیں جسے ہوا غلہ سے جُدا کرتی ہے۔ پس اگر وہ کھایا ہوا ہو تو اس میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

سورۃ الکوثر

فَصَلِّ لِرَبِّكَ کا مفہوم

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۲:۱۰۸) پس اپنے رب کے لیے صلوٰۃ قائم کر اور نحر کر۔

ابو مسلم کے نزدیک اس میں پانچوں فرض نمازیں مراد ہیں اور کیفیت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ پہلے سے معلوم تھی۔

سورۃ الکٰفرون

لفظِ "ما" کی بحث

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (۲:۱۰۹) میں اس کی عبادت نہیں کرتا جسے تم پوجتے ہو۔

ابو مسلم فرماتے ہیں سورۃ کا مطلب یہ ہے کہ جنہیں تم پوجتے ہو میں ان بتوں کی پوجا نہیں کرتا جس طرح تم اللہ کی عبادت نہیں کرتے "ما"، فعل کے ساتھ تاویل مصدر کے لیے ہے یعنی میں تمہارے جیسی عبادت نہیں کرتا جو شرک پر مبنی ہے اور نہ تم وہ عبادت کرتے ہو جو حق اور یقین ہے۔ پس اگر تمہیں یہ گمان ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرتے ہو تو یہ گمان باطل ہے کیونکہ عبادت وہ ہے جس کا حکم دیا گیا ہو نہ یہ کہ جس سے منع کیا گیا ہو۔

سورۃ اللہب

تبت یدا کا مفہوم

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۔ (۱/۱۱۱)
ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوئے اور وہ خود بھی ہلاک ہوا۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ " تَبَّتْ یَدَآ " مال کا تباہ ہونا مراد ہے کیونکہ صاحب مال کو " ذاتُ الید " کہتے ہیں۔ اور تب سے اس کا اپنا تباہ ہونا مراد ہے، جیسے کہا گیا خسروا انفسھم واھلیھم " (وہ خود بھی گھاٹے میں رہے اور ان کی اصل بھی۔

حمالۃ الحطب کا مطلب

وَامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۴/۱۱۱)
اور اس کی بیوی ایندھن اٹھانے والی ۔

ابومسلم اور سعید بن جبیر کے نزدیک " حمالۃ الحطب " کے معنی گناہوں کا وہ بوجھ ہیں جو اس نے رسول کی عداوت میں اٹھایا، وہ بوجھ عذاب کی آگ کے لیے ایندھن کا کام دے گا۔ حمل کا لفظ گناہوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے اکثر جگہ استعمال ہوا ہے۔ جیسے ارشاد ہے
فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا۔

سورۃ الفلق

النّفّٰثٰتِ فِی العُقَدِ کے معنی

مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ - (۱۱۳/۴) گانٹھوں میں پھونکیں مارنے والوں کے شر سے (اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں -

ابومسلم کے نزدیک اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو مردوں کے عزائم میں عقدہ ڈالتی ہیں، اور یہ "عقد حبال" (رسیوں کی گانٹھ) سے استعارہ ہے۔ "نفث" اس پھونک کو کہتے ہیں جس میں تھوک بھی شامل ہو۔ یہ رسی کی گانٹھ کو نرم کرنے کے لیے اس میں ڈالی جاتی ہے تاکہ اس کا کھلنا آسان ہو۔ پس آیت کے معنی یوں ہوئے کہ عورتیں حسن کی وجہ سے مردوں کے دلوں میں اتر جاتی ہیں، پھر انہیں اپنے تصرف میں لے آتی ہیں، پھر جدھر چاہیں ان کے دل گھما سکتی ہیں - اس طرح مردوں کی آراء اور ان کے عزائم بدلتے رہتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو ان کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا جیسا کہ کتاب اللہ میں ہے اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَ اَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ (بے شک تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے تمہارے دشمن ہیں پس ان سب سے بچو)۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ ابومسلم کا یہ قول بہت عمدہ ہے اگرچہ اکثر مفسرین کے قول کے خلاف ہے -

Institute of Islamic Culture - An Introduction

The Institute of Islamic Culture was founded in 1950 with a view to presenting the ideology of Islam to the modern mind and bringing to Muslim youth a consciousness of their intellectual, cultural and spiritual heritage. Since the modern secular system of education started functioning in the Indo-Pakistan subcontinent and elsewhere in the Muslim world, it has brought about two notable consequences for Muslim youth. Firstly, a progressive decline in their self-consciousness as heirs to a great spiritual civilization with its own distinct intellectual and moral outlook, and secondly a growing scepticism and a questioning attitude towards the validity of religious truth. While a passive acceptance of prevalent beliefs, such as marked the era of our intellectual decline, has been naturally followed by a questioning spirit and is so far a welcome change introduced by the modern system of education. It also calls for proper guidance on the part of the intellectual leaders of Islam, because in the absence of healthy guidance the immature younger generation is likely to lose its way and stumble on subversive doctrines. It is one of the aims of the Institute of Islamic Culture to cater to the spirit of inquiry and questioning among the Muslim youth to make them fully conscious of their intellectual, cultural and moral heritage.

The modern scientific spirit does not accept ready made truths or proceed deductively from simple given propositions. It has brought a spirit of inductive inquiry. The result has been a clash with the religious mode of thought which takes certain propositions for granted and then proceeds deductively. To resolve this conflict between the scientific and the religious attitudes is another main objective of the Institute.

Again, the nature of human problems has changed completely since the birth of the present-day industrial civilization. People are not so much interested in the metaphysical foundation of religion or its doctrinal side now as in its attitude to social problems and the way to which it proposes to tackle them. It is one of the aims of the Institute of Islamic Culture to demonstrate that the Islamic outlook and the fundamental principles of Islam are still capable of giving a lead in the solution of human problems. Thus the Institute has taken upon itself the task of giving a progressive, rational view of Islam to explain its attitude to current problems, and to show how the political, social and economic life of Muslims can be remodeled in accordance with the basic principles and abiding values of Islam, without injury to material prosperity and technical efficiency.

With this object the Institute has published, in both the Urdu and English languages, a number of books, pamphlets and treatises written by distinguished scholars explaining the fundamental truths of Islam and their application to modern social, economic, political and intellectual problems. The Institute has also published books on the cultural and religious history of Muslims. It has further published a compendium of the Holy Prophet's (pbuh) traditions, selected from the vast Hadith literature in such a way as to give an idea of the broad, liberal and tolerant teachings of the Prophet. (pbuh) Besides, a few books have been published on the famous poets, mystics and thinkers of Islam like Rumi, Ghazali, Ibn Khaldun, Ibn Taimiyyah, Imam Abu Hanifah, Sayyid Ahmad Khan, Allama Shibli, Altaf Husain Hali, and Maulana Muhammad Ali Jauhar. The Institute includes within its sphere of work translations from Arabic and Persian classics and also modern Arabic and Persian literature on Islam in so far as they bear on our social and intellectual problems. The Institute also publishes a religious and literary monthly magazine in Urdu, Al-Ma'arif, in which contemporary problems are discussed from the Islamic viewpoint.

The Institute has no political or sectarian associations and cschews all controversies in these spheres. It invites the co-operation of all Muslim and non-Muslim intellectuals who are interested in Islam and desire to work for the intellectual regeneration of Muslims from a broad non-sectarian viewpoint.